نوی زبان

بیادِ علامہ اقبال

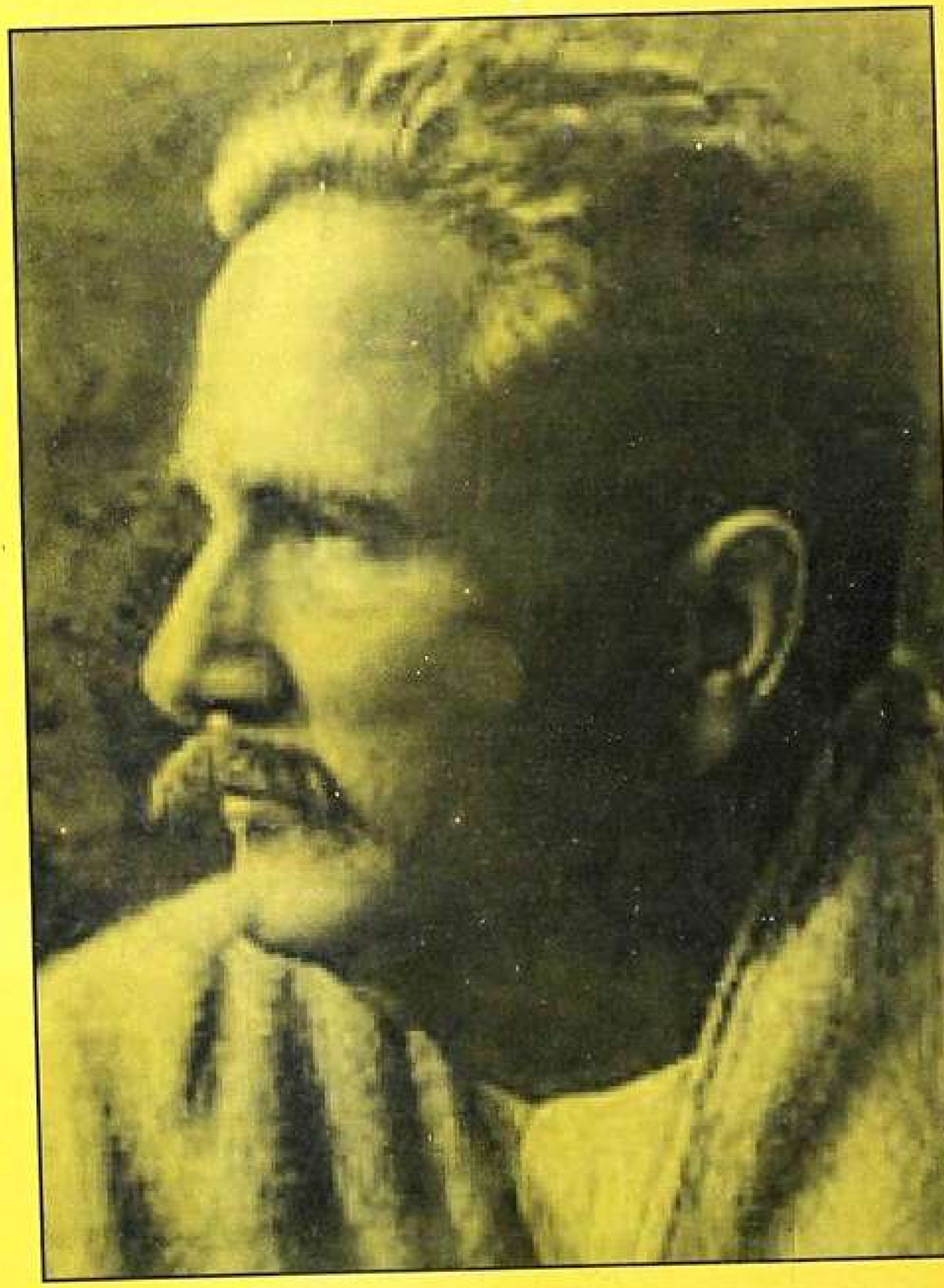

ماہنامہ

قومی زبان

کراچی

بانی: بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

جاری شدہ: پاکستان میں ۱۹۴۸ء

قومی زبان، نومبر ۲۰۰۹ء، جلد ۸۱، شمارہ: ۱۱

ادارۂ تحریر

ادا جعفری

جمیل الدین عالی

مدیر

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں

بدل اشتراک

فی پرچہ ——— ۱۵ روپے

سالانہ صرف رجسٹری سے ۳۰۰ روپے

بیرونِ ملک

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ/۱۵ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ/۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اُردو پاکستان

شعبۂ تحقیق و تالیف و تصنیف

ڈی-۱۵۹، بلاک ۷، گلشنِ اقبال

کراچی ۷۵۳۰۰

فون: ۴۸۱۱۴۰۶-۴۹۷۳۲۹۶

مضمون نما

اداریہ		۳
اقبال کی تاریخی تلمیحات	ڈاکٹر بصیرہ عنبرین	۵
اقبال اور جامی	ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان	۱۵
اقبال شناسی میں خواتین کا کردار	طاہرہ صدیقہ	۲۰
تابش دہلوی۔ تہذیبی تشخص کے شاعر	خواجہ رضی حیدر	۳۱
اردو فکشن۔ روایت تکنیک اور رجحانات	شیراز زیدی	۳۶
عندلیب شادانی کی غزل گوئی	پروفیسر افتخار اجمل شاہین	۵۱
ترکی میں اردو	ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی	۵۶
محمد خالد اختر کا ناول: بیس سو گیارہ	ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان	۵۹
رفتارِ ادب		۷۰
گردوپیش		۷۵
نئے خزانے	رفیق احمد نقش	۸۳

qaumi.zaban@yahoo.com

www.anjumantaraqqiurdu.com

گلے میں ہو خراش، آئے ورم یا آواز بیٹھ جائے

ہمدرد

شربت
تُوت سیاہ

سردی آتے اور جاتے وقت گلے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے ایسے میں
گلے میں خراش، ورم آنے یا، آواز بیٹھ جانے
کی شکایات عام ہوتی ہیں۔ ہمدرد شربت توت سیاہ کی چند خوراکیں گلے کی
ان شکایات کا فوری خاتمہ کرتی ہیں۔ اب سردی آئے یا جائے۔ آپ
کے گلے کو کیا گلہ۔ کیونکہ آپ کو تو ہے ہمدرد شربت توت سیاہ ملا۔

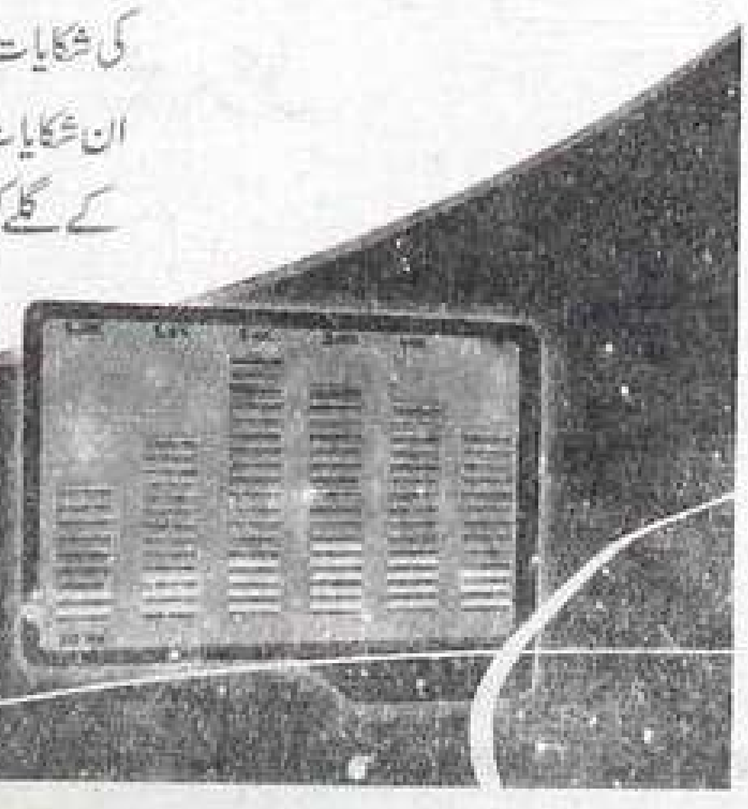

بولو کھل کھلائے!

اداریہ

حسبِ سابق علامہ اقبال کو ہم نومبر کے حوالے سے یاد کرتے ہوئے چند مضامین پیش کر رہے ہیں اس لیے کہ وہ بین الاقوامی سطح پر ایک عظیم شاعر، ادیب اور دانشور کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ہمارے لیے تو وہ ناقابل فراموش ہستی ہیں اس لیے کہ انھوں نے اس دور میں اپنے کلام اور فکر سے قوم کو متاثر اور متحرک کیا جب وہ مایوسی اور بے یقینی کا شکار تھی۔ واضح رہے کہ بغیر رہنمائی کے کوئی قوم اپنی زندگی میں واضح سمت اختیار نہیں کر سکتی۔ اقبال مایوسی کی تاریکی میں امید کے چراغ جلاتے ہیں۔ سب اس حقیقت سے واقف ہیں کہ امید کے جذبے کے بغیر مصائب اور دشواریوں کے عفریت پر قابو پانا ناممکن ہے۔ دنیا کی قوموں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے کہ ان کے رہنماؤں نے امید و عمل کو بنیاد بنا کر تحریک چلائی اور کامیابیوں سے ہمکنار ہوئے اور دوسری قوموں کے لیے قابل تقلید بنے۔ آج ہم جس عہد میں جی رہے ہیں وہ اداسی، مایوسی اور انتشار کی طرف دھکیل رہا ہے۔ مختلف النوع آوازیں ذہن کو شل کر رہی ہیں، یوں محسوس ہو رہا ہے گویا ہم بند گلی میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ ایسے میں علامہ اقبال کا پیغام روشنی ضمانت بن سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم میں اتحاد بھی ہو تاکہ ہمیں صحیح سمت مل سکے۔ آیئے اس پر غور کریں۔

قومی زبان میں ''نئے خزانے'' کا سلسلہ ایک عرصے سے تعطل کا شکار تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس سلسلے کو جدید خطوط کی بنیاد پر پھر سے بحال کیا جا رہا ہے۔ ستمبر ۲۰۰۹ء کے شمارے میں ''پس منظر'' کے تحت کچھ گزارشات پیش کی گئی تھیں۔ اب اس کے موضوعات میں توسیع کر کے اسے ۲۰۰۸ء جنوری سے بحال کیا جا رہا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ ہمارے قارئین، ناقدین اور محققین ''نئے خزانے'' سے یقیناً مستفید ہوں گے۔

انجمن کی تازہ مطبوعات

نام کتاب	مصنف	قیمت
۱۔ تاریخ انجمن بابائے اردو کے بعد	شہزاد منظر/تکملہ: ادیب سہیل	175/-
۲۔ انجمن ترقی اردو کا المیہ	بابائے اردو مولوی عبدالحق	75/-
۳۔ سرسید احمد خاں، حالات و افکار	بابائے اردو مولوی عبدالحق	75/-
۴۔ کہانی رانی کیتکی	میر انشاءاللہ خاں انشا	70/-
۵۔ متنی تنقید	خلیق انجم	300/-
۶۔ حرفے چند (جلد چہارم)	جمیل الدین عالی	250/-
۷۔ تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت (جلد اوّل، جلد دوم)	سید ہاشمی فرید آبادی	550/-
۸۔ اردو ادب کی جستجو	رالف رسل	350/-
۹۔ غالب درونِ خانہ	کالی داس گپتا رضا	350/-
۱۰۔ جدید اور مابعد جدید تنقید	ناصر عباس نیر	300/-
۱۱۔ غالب ایک مطالعہ	ممتاز حسین	150/-
۱۲۔ ممتاز حسن احوال و آثار	فرزانہ ناہید گیلانی	225/-
۱۳۔ غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ	خلیق انجم	350/-
۱۴۔ اردو ناول کے چند اہم زاویے	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں	160/-
۱۵۔ آزادی کے بعد اردو ناول (ہیئت اسالیب اور رجحانات ۱۹۴۷ء۔ ۲۰۰۷ء، دوسرا ایڈیشن)	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں	300/-
۱۶۔ پاکستان میں اردو دوہے کی روایت	کنول ظہیر	250/-
۱۷۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کی مطبوعات (توضیحی کتابیات)	محمد اشرف کمال	250/-
۱۸۔ زخ ش حیات و شاعری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر فاطمہ حسن	250/-
۱۹۔ اردو ادب کی تحریکیں	ڈاکٹر انور سدید	300/-
۲۰۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام	بابائے اردو مولوی عبدالحق	80/-
۲۱۔ محمد حسین آزاد (مکمل سیٹ)	ڈاکٹر اسلم فرخی	625/-
۲۲۔ غالب کے خطوط (مکمل سیٹ)	خلیق انجم	790/-
۲۳۔ عبدالحلیم شرر بہ حیثیت ناول نگار	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	250/-

انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی۔ ۷۵۳۰۰

ڈاکٹر بصیرہ عنبرین☆

اقبال کی تاریخی تلمیحات

تلمیح یا چشم زد(۱) جسے تملیح بھی کہا گیا(۲)، عربی مادے ''لَمح'' سے مشتق ہے۔ لغوی سطح پر اس سے مراد اشارہ کرنا یا دیکھنا(۳)، کسی چیز پر نگاہِ سبک ڈالنا(۴) کم نگاہی سے دیکھنا، سرسری یا ہلکی نگاہ(۵)، گوشۂ چشم سے کسی چیز کو تکنا یا اس پر نگاہ ڈالنا(۶)، آنکھ کے کنارے یا سرے سے اشارہ کرنا(۷)، کسی امر کا بالواسطہ، ناراست، ٹیڑھا اور مخفی تذکرہ، سرسری و اُچٹتی نگاہ، معمولی سی جھلک، پرتو، لشکارا یا جھپکی(۸)، استصوابِ رائے کرنا، سراغ رسانی کرنا، کھوج لگانا، آشکار کرنا یا کھولنا(۹) ہے، اور اس کا زیادہ تر تعلق نگاہ و نظر یا خیال و تصور سے بیان کیا جاتا ہے۔(۱۰)

علمِ بدیع کی اصطلاح میں تلمیح اس شاعرانہ حربے کو کہتے ہیں جس کے تحت کہنے والا یا لکھنے والا اپنے کلام یا تحریر میں، کم سے کم الفاظ میں کسی قصے، آیت، حدیث، شخصیت، یا مشہور واقعے کی طرف اشارہ کرے(۱۱)، کسی قصہ طلب واقعے سے مضمون پیدا کرے(۱۲)، کسی ایسی چیز کا ذکر کرے جو کتب مستعملہ میں مذکور ہو(۱۳) مشہور شعر یا ضرب المثل یا کسی مسئلے کو کلام میں لائے جیسے مقررین اہم واقعات کی طرف بسا اوقات جملوں اور لفظوں میں اشارہ کرتے ہیں(۱۴)، بعض علوم کی علمی و فنی اصطلاحات کو طرزِ بیان کا حصہ بنائے(۱۵)، مثلاً نجوم، ریاضی، موسیقی، طبیعی علوم وغیرہ کی اصطلاحیں اپنے کلام میں لائے(۱۶)، کسی تعبیر کی طرف اشارہ کرے یا فرہنگِ عامہ، عقاید و آداب و رسوم و علومِ قدیم کا تذکرہ(۱۷) ایسے انداز میں کرے جس سے اس کے کلام کی معنویت میں اضافہ ہو پائے۔ اس ایک اشارے کی ادائی سے نہ صرف وہ شخص، چیز یا واقعہ وغیرہ یاد آ جائے اور بھرپور انداز سے کلام کی توضیح ہو بلکہ جب تک اس مختصر اشارے کی وضاحت نہ ہو، کلامِ شاعر کی بخوبی تفہیم بھی نہ ہو سکے۔ گویا تلمیح کا مقصد ان مختلف قبیل کے اشارات سے تقویتِ معنی میں اضافہ کرنا اور قارئین سے اپنی شاعری کا اثبات کرانا ہے۔

علامہ اقبال کے کلام میں تلمیح کے اس مربوط، منظم اور کثیر الجہتی نظامِ فن کا جائزہ لیں تو ہمیں اس کی متنوع حیثیات دکھائی دیتی ہیں۔ اقبال اس شاعرانہ حربے کے تحت اپنی شاعری میں کم سے کم الفاظ میں ماضی و حال کی کسی فرضی یا حقیقی شخصیت، واقعے، قصے یا اسطورہ، آیت یا حدیث، ضرب المثل، مشہور شعر یا ادب پارے، علمی و فنی مسئلے یا اصطلاح، علم قدیم و جدید، علمی، سیاسی یا سماجی تحریک یا

☆ شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

اپنی ذاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کشی ایسی جامعیت سے کرتے ہیں کہ ان کا کلام صوری و معنوی حسن سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ علامہ کے ہاں کلاسیکی و جدید دونوں طرح کی تلمیحات موجود ہیں۔ وہ کلاسیکی تلمیحات کے زیر اثر روایتی تلمیحوں کو جدتِ معنوی عطا کرتے ہیں اور جدید تلمیحات کے تحت اپنی ذات، خانوادے، معاصر شخصیات، اعزّہ و احبا کا تذکرہ اور مسائلِ جدیدہ کو پیرہنِ شعری میں سمیٹتے ہیں۔ بلاغت، ان کے اس نظامِ تلمیح کا وصفِ خاص ہے اور اسی کے سبب ان کی تلمیحوں میں بیک وقت تاریخ کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے اور حالیہ اقعات وحوادث کے نقوش بھی بخوبی اجاگر ہو پاتے ہیں۔ مزید برآں اقبال کے وضع کردہ لفظی و معنوی اضافات و تصرفات اور ان کے ہاں بعض مرکزی تلمیحات (Central Allusions) کی موجودگی ان کے تلمیحاتی ذخیرے کو انفرادی شان عطا کرتی ہے۔

شعر اقبال میں متذکرہ تلمیحاتی نوعیتوں میں علامہ کی تاریخی واقعات وحوادث اور اشخاص و امکنہ پر مبنی صورت خصوصیت کے ساتھ لائق مطالعہ ہے۔ اقبال کی تاریخی تلمیحوں کو بنیادی طور پر دو حصوں اسلامی اور غیر اسلامی تلمیحات میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی تاریخی شخصیات میں اولاً تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی ذاتِ مبارکہ سے وابستہ اور بعض بعد کی اسلامی شخصیات کا تلمیحاً تذکرہ کرتے ہیں، پھر علامہ تاریخِ اسلام کے ان اشخاص کو اپنے کلام میں بطور تلمیح لاتے ہیں جن کا تعلق دنیا کے مختلف خطوں سے رہا اور جنھوں نے مختلف زمانوں میں اسلام کی سطوت و عظمت کے جھنڈے گاڑے جب کہ غیر اسلامی تاریخ کی تلمیحات کے تحت اقبال نے قبلِ مسیح کے بعض اہم تاریخی کرداروں اور واقعات کے ساتھ ساتھ غیر اسلامی دنیا کے مختلف ادوارِ تاریخ میں نمایاں نقوش ثبت کرنے والے اشخاص و وقائع کے اشارات کو تقویتِ معنی کے لیے پیوندِ شعر کیا ہے۔ ذیل میں دونوں حوالوں سے اقبال کے اندازِ تلمیح پر روشنی ڈالی جاتی ہے:

(ا) اسلامی تاریخ کی تلمیحات:

اسلامی تاریخ کی تلمیحات میں اقبال نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ سے وابستہ افراد کے علاوہ بعد کی اسلامی تاریخی شخصیات کو اپنے کلام کی معنویت میں اضافے کے لیے مستعار لیا ہے۔ میرِ حجازؐ، محمدِ عربیؐ اور سالارِ کاروانِ ملت سے والہانہ لگاؤ کا اظہار ویسے تو کلامِ اقبال کے اوراق میں بارہا ملتا ہے مگر خالصتاً تلمیح کے زاویے سے اقبال کے ہاں غزواتِ بدر و حنین سے متعلق تلمیحات کے ساتھ ساتھ (بہ مشتاقاں حدیثِ خواجہؐ بدر و حنین آور + تصرف ہائے پنہانش بچشم آشکار آمد، ب د،۲۷۵) اور حضورؐ کی مکے سے مدینے کی جانب ہجرت کے واقعے کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر کی تائید کے لیے تلمیحاً موزوں کرنے کا رجحان ملتا ہے (ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہیؐ + دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی + گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے + ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے، ب د، ص ۱۶۰) خصوصاً علامہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابولہب کی تلمیح لا کر دو متضاد مکاتیبِ فکر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ''مصطفویؐ'' اور ''بولہبی'' ان کے کلام میں علامات کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور وہ کفر اسلام کی کشاکش پیش کرتے ہوئے ان علامتی تلمیحوں سے معنی اخذ کرتے ہیں، مثلاً:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی (ب د، ۲۲۳)

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا　　عشق تمام مصطفیٰؐ، عقل تمام بُولہب　　(ب ج، ۱۱۴)
یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس اُمّت کو　　وصالِ مصطفویؐ، افتراقِ بُولہبی　　(ض ک، ۶۳)
بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است　　(ا ح، ۴۹)

کلامِ اقبال میں شامل متذکرہ دیگر تلمیحی شخصیتوں میں حضرتِ فاطمۃ الزہراؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت خالدؓ بن ولید، حضرت عمرؓ، حضرت بلالؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت اویس قرنیؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابو ایوب انصاریؓ، حضرت امام حسینؓ اور حضرت عقبہؓ بن نافع شامل ہیں۔ یہ درست ہے کہ اقبال نے ان میں سے کچھ تلمیحیں بہت کم برتی ہیں مگر ان کی پیش کش میں کمال درجے کی پرکاری ضرور نظر آتی ہے۔ مثلاً وہ حضرتِ عمرؓ کے دائرۂ اسلام میں داخل ہو کر اس کو استحکام دینے، حضرتِ عثمانؓ کے اسلام کے لیے بے پایاں دولت صرف کرنے، حضرت خالد بن ولیدؓ کے ہر لحظہ جہاد کے لیے مستعد رہنے، حضرت ابوذر غفاریؓ کے فقر و درویشی اختیار کرنے اور حضرتِ فاطمہؓ کے عفت و عصمت کے تاریخی حوالوں کو پیشِ نظر رکھ کر ''دلِ بیدار فاروقی''، ''دولتِ عثمانی''، ''خالدِ جانباز''، ''فقرِ بوذر'' اور ''چادرِ زہرا'' جیسی مؤثر تلمیحاتی تراکیب اختیار کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ ''سلمان الخیر''، حضرتِ سلمان فارسیؓ کے صدق و صفا، فقر و غنا اور عشقِ رسولؐ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نادیدہ عاشق، ''خیر التابعین''، حضرت اویس قرنیؓ کے جذبۂ حُبِ محمدؐ کو بڑی کامیابی سے اصلاحِ احوال کے لیے تلمیح کر دیتے ہیں (عشق کو عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا + رسمِ سلمان و اویس قرنی کو چھوڑا، ب د ۱۶۸)، بعینہٖ شعرِ اقبال میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کا تلمیحی حوالہ بھی موجود ہے اور وہ افریقہ کے والی حضرت عقبہ بن نافع کے جذبۂ جہاد کو بھی پرتاثیر اور بامعنی انداز میں پیوندِ کلام کرتے ہیں (دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے + بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے، ب د، ۱۶۶)

تاہم ان مختصر مگر بلیغ اشارات کے علاوہ اقبال نے بعض تلمیحوں کا بہ تکرار استعمال کیا ہے اور ایک سطح پر یہ تلمیحیں علامہ کی خاص علامتوں اور کنایوں کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت بلالؓ، حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ سے متعلق تلمیحات قابلِ مطالعہ ہیں۔ ان میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح کی تلمیحیں واقعاتی رنگ لیے ہوئے ہیں اور ان کی وساطت سے اقبال نے تاریخ اسلام کے دو اہم واقعات کو پیش کیا ہے۔ پہلا واقعہ ''غزوۂ تبوک'' سے متعلق ہے، جس میں حضرت صدیقِ اکبرؓ نے اپنا تمام مال و متاع اسلام کی خاطر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر کے اپنے لیے رفاقتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کافی سمجھا۔ اس واقعاتی تلمیح میں علامہ کے ہاں تحسینی رجحان بھی ابھر کر سامنے آیا ہے اور عشقِ رسولؐ کی ایک نادر جھلک بھی مل جاتی ہے:

اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر!　　اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار!
پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس　　صدّیق کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس　　(ب د، ۲۲۴، ۲۲۵)

جب کہ دوسرا واقعہ ''جنگِ یرموک'' سے وابستہ ہے جس میں فاتح شام اور نامور سپہ سالار حضرت ابوعبیدہؓ کی تلمیح پیش ہوئی ہے جنھوں نے حضرت صدیقِ اکبرؓ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا اور ان کا بے مثل کارنامہ رومی فرمانروا ہرقل کا مقابلہ کر کے فتح یاب ہونا ہے۔ اقبال اسی جنگ کے ایک واقعے کا تذکرہ کرتے ہیں جس میں حضرت ابوعبیدہؓ کے لشکر کے ایک سیماب صفت فرزند نے لڑائی کی اجازت طلب کی تا کہ حضورؐ کے عشق میں جان قربان کرنے کے اعزاز سے بہرہ مند ہو۔ اس نوجوان نے آپؓ سے کہا کہ میں رسولِ پاکؐ کی بارگاہ میں آپؓ کا کیا پیغام لے جاؤں تو آپؓ نے فرمایا کہ انھیںؐ میرا اسلام کہنا اور بتانا کہ دین کی فتح و نصرت کے جو وعدے آپؐ نے فرمائے تھے، وہ سب پورے ہو رہے ہیں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ یہ تلمیحی واقعہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ نظم میں سمٹ میں آیا ہے اور اقبال نے اس تمام تر فضا کو کامیابی سے اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے، مذکور تلمیحی نظم کا آخری حصہ دیکھیے:

پوری کرے خدائے محمدؐ تری مراد — کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام
پہنچے جو بارگاہ رسولِؐ امیں میں تو — کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام
ہم پر کرم کیا ہے خدائے غیور نے — پورے ہوئے جو وعدے کیے تھے حضورؐ نے (ب د، ۲۴۷)

کلامِ اقبال میں موذنِ رسولؐ، حضرت بلالؓ کا تذکرہ سرتاسر عشق و عقیدت کی علامت کے طور پر آیا ہے اور اقبال نے آپؓ کے اس بے مثال جذبے کو مختلف اسلامی شخصیات، حضرت موسیٰ کلیم اللہ، حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت اویس قرنیؓ کی جذبۂ عشق پر مبنی تلمیحوں کے استمداد سے زیادہ صراحت سے پیش کر دیا ہے، جیسے لکھتے ہیں:

نظر تھی صورتِ سلماںؓ ادا شناس تری — شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری
تجھے نظارے کا مثلِ کلیم سودا تھا — اویسؓ طاقتِ دیدار کو ترستا تھا
مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا — ترے لیے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا (ب د، ۸۰، ۸۱)

''ابوالحسن''، حضرت علیؓ اسلامی تاریخ میں شجاعت و دلیری کا کنایہ ہیں اور اسی نسبت سے آپؓ کو ''حیدرِ کرار، یا ''اسداللہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ آپؓ نے اپنے تنِ خاکی کو فقر و غنا سے تسخیر کرنے اور جہاد کے ذریعے سے اثباتِ حق کرنے کے سبب ''ابوتراب'' اور ''یداللہ'' بھی کہلاتے ہیں۔ آپؓ فاتحِ خیبر اور آپؓ کے ہاتھوں مرحب اور عنتر جیسے سرکش قتل ہوئے۔ اقبال کے کلام میں ''اسداللہٰی ویداللہٰی'' حق اور ''مرحبی و عنتری'' کفر و استبداد کی علامتیں ہیں اور وہ حضرت علیؓ سے متعلق ان مختلف تلمیحوں کو اسی تناظر میں پیش کر کے مسلمانوں میں حرکت و حرارت عمل پیدا کرتے ہیں، اقبال کا اندازِ تلمیح ملاحظہ ہو:

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر — کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری (ب د، ۲۵۲)
نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے — وہی فطرتِ اسداللہٰی، وہی مرحبی، وہی عنتری (=، ۲۵۳)
بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن — اس زمانے میں کوئی حیدرِ کرار بھی ہے (ب ج، ۶۴)

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے — کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے (=، ۸۷)
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی — کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کرّاری (ض ک، ۱۷۱)

شعرِ اقبال میں نواسۂ رسولؐ، خلف الرشید علیؓ، جگر گوشۂ بتولؓ، حضرت امام حسینؓ، کی تلمیح صبر و استقامت اور ایمان و ایقان کے استعارے کے طور پر آئی ہے۔ آپؓ اہلِ کوفہ و شام کی خاطر یزید سے برسرِ پیکار ہوئے اور شہادت کا رتبہ پایا، اقبال اسی مقامِ شبیریؓ کو مومن کا شعارِ خاص قرار دیتے ہیں، مثلاً لکھتے ہیں:

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیریؓ — بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی (ب ج، ۷۳)
قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں — گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات (=، ۱۱۲)
اک فقر ہے شبیریؓ، اس فقر میں ہے میری — میراثِ مسلمانی، سرمایۂ شبیریؓ (ب ج، ۱۶۰)
نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیریؓ — کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری (ا ج، ۳۸)

بعض اوقات اقبال تاریخ اسلامی کے مختلف اشخاص کا تذکرہ ایک ہی شعر میں ایسے موثر طور پر کرتے ہیں کہ تلمیح کا حربہ زیادہ بامعنی اور کارگر محسوس ہونے لگتا ہے، مثلاً:

حیدریؓ فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے — تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے (ب د، ۲۰۵)
یہی شیخِ حرم ہے جو چُرا کے بیچ کھاتا ہے — گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ (ب ج، ۲۳)
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے — دلِ مرتضیٰؓ، سوزِ صدیقؓ دے (=، ۱۲۴)
یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے — رہی نہ دولتِ سلمانیؓ و سلیمانیؑ (ض ک، ۵۱)
اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا، لیکن — بنتی ہے بیاباں میں فاروقیؓ و سلمانیؓ (=، ۱۷۹)

جہاں تک دنیا کے مختلف خطوں سے وابستہ اسلامی شخصیات کا تعلق ہے، اس ضمن میں اقبال کے ہاں عرب و عجم کے معروف حکمرانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے بعض اہم مسلم اشخاص کا تذکرہ بھی تواتر کے ساتھ ملتا ہے۔ عرب و عجم کی تلمیحی شخصیتوں میں وہ طارق بن زیادہ، عبدالرحمٰن اول، ہارون رشید، طغرل، معتمد، سلطان سنجر اور سلطان سلیم سے متعلق تاریخی واقعات و حوادث کو منفرد جہتیں عطا کرتے اور ان میں سے بیشتر کو عظمت و سطوت کے استعاروں کے طور پر برتتے نظر آتے ہیں مثلاً تلمیح میں ندرت پیدا کرتے ہوئے وہ کہیں اندلس کے میدانِ جنگ میں طارق بن زیاد کے جذبۂ جہاد، اعتمادِ نفس اور شوقِ شہادت کو دعا کل شکل میں ڈھال دیتے ہیں۔ (شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن + نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی، ب ج ۱۰۵) تو کہیں خاندانِ عباسیہ کے معروف حکمران ہارون رشید کی آخری نصیحت کو بطور تلمیح لا کر مسلمان کے تصورِ مرگ کو اجاگر کرتے ہیں (پوشیدہ ہے کافر کی نظر سے ملک الموت + لیکن نہیں پوشیدہ مسلماں کی نظر سے، ب ج ۱۶۷) اسی طرح وہ شاہِ قرطبہ، عبدالرحمٰن اول، الداخل کے چند اشعار کو جو اس نے ہسپانیہ میں اپنے بوئے

ہوئے کھجور کے پہلے درخت سے مخاطب ہو کر لکھے، اس طرح تلمیحا ماخوذ کرتے ہیں کہ ایک طرف عبدالرحمٰن اوّل کی عباسیوں کے استبداد کے پیشِ نظر شام سے اُندلس کی طرف مہاجرت کا واقعہ تازہ ہو جاتا ہے تو دوسری طرف ان شعری احساسات کا انسلاک اسلام کے ماورائے حدود و ثغور تصورِ وطنیت سے ہونے لگتا ہے۔ (صبحِ غربت میں اور چمکا + ٹوٹا ہوا شام کا ستارہ + مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے + مومن کا مقام ہر کہیں ہے، ب ج،۱۰۳) اقبال ان تاریخی تلمیحوں میں سے بعض کی تمثیلی و علامتی جہتیں بھی ابھارتے ہیں، جیسے انھوں نے اشبیلیہ کے دورِ زوال کے حکمران المتمد علی اللہ کی یوسف بن تاشفین کے ہاتھوں اسیری و بے بسی کا نقشہ اس مہارت سے جمایا ہے کہ تلمیح میں تمثیل کے عناصر ابھر آتے ہیں (خود بخود زنجیر کی جانب کھنچا جاتا ہے دل + تھی اسی فولاد سے شاید مری شمشیر بھی + جو مری تیغِ دودم تھی، اب مری زنجیر ہے + شوخ و بے پروا ہے کتنا خالقِ تقدیر بھی!، ب ج ۱۰۲) اسی طرح علامہ کے کلام میں سلاجقۂ بزرگ کے اولین بادشاہ طغرل بیگ اور آخری سلجوقی حکمراں سلطان سنجر کے ساتھ ساتھ سلطان سلیم عثمانی کی قوت و شوکت پر مبنی تلمیحات مسلم شکوہ کی علامت بن گئی ہیں:

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود — فقرِ جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب (ب ج،۱۱۳)

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی — نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر (ض ک،۶۷)

ہندوستان سے متعلق تاریخی تلمیحات کے سلسلے میں اقبال نے یہاں کی مسلم شخصیات قطب الدین ایبک، شیر شاہ سوری، جہانگیر، شاہ عالم ثانی، غلام قادر رہیلہ اور ٹیپو سلطان کے علاوہ باہر سے آنے والے بعض حکمرانوں محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، امیر تیمور اور نادر شاہ افشار کے ذکر سے معنویت پیدا کی ہے۔ مقامی مسلم شخصیات میں اقبال کے ہاں ہندوستان کے پہلے مسلمان بادشاہ قطب الدین ایبک کے معرکوں اور مغل بادشاہ نور الدین جہانگیر کی سطوت کی جانب مختصر اشارے ملتے ہیں جب کہ شیر شاہ سوری کی قابلیت اور سیاسی بصیرت کو بھی وہ ستائش کی نظر سے دیکھتے ہیں (یہ نکتہ خوب کہا شیر شاہ سوری نے + کہ امتیازِ قبایل تمام تر خواری، ض ک ۱۷۷) تاہم ان کی تفصیلی توجہ غلام قادر رہیلہ اور ٹیپو سلطان کی طرف دکھائی دیتی ہے۔ غلام قادر رہیلہ کا ذکر واقعاتی انداز کی تلمیح میں ملتا ہے جس میں اقبال نے اسے شاہ عالم ثانی سے رہیلہ خواتین کی تذلیل کا انتقام لیتے یوں دکھایا ہے کہ دودمانِ تیموری کے زوال کا نقشہ اتار کر رکھ دیا ہے:

رُہیلہ کس قدر ظالم، جفا جُو، کینہ پرور تھا — نکالیں شاہِ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے
دیا اہلِ حرم کو رقص کا فرماں ستم گر نے — یہ اندازِ ستم کچھ کم نہ تھا آثارِ محشر سے

...

رکھا خنجر کو آگے اور پھر کچھ سوچ کر لیٹا — تقاضا کر رہی تھی نیند گویا چشمِ احمر سے

...

پھر اٹھا اور تیموری حرم سے یوں لگا کہنے — شکایت چاہیے تم کو نہ کچھ اپنے مقدر سے

مرا مسند پہ سو جانا بناوٹ تھی، تکلّف تھا — کہ غفلت دور ہے شانِ صف آرایانِ لشکر سے
یہ مقصد تھا مرا اس سے، کوئی تیمور کی بیٹی — مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر — حمیّت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے (ب د،۱۲۸،۲۱۹)

والیِ میسور، ابوالفتح، ٹیپوسلطان نے جس دلیری سے ہندوستان کو اغیار کے تسلط سے نجات دلاتے ہوئے شہادت کا مرتبہ پایا، اقبال اسے سراہتے ہوئے سلطان شہید کی وصیت موزوں کرتے ہیں جس کی وساطت سے تلمیح پیغامبری کا فریضہ انجام دینے لگتی ہے، لکھتے ہیں:

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے — جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول
باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے — شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول (ض ک،۷۳)

ہندوستان میں وارد ہونے والے بیرونی حکمرانوں میں اقبال، فاتحِ سومنات و اجمیر، سلطان محمود غزنوی کی جلالت و شوکت اور بت شکنی کے قائل نظر آتے ہیں۔ خصوصاً وہ اس تلمیح میں سلطان کے وفادار غلام ایاز کے ذکر سے علامتی رنگ ابھارتے ہیں۔ چناں چہ ان کی شاعری میں کہیں محمود، عظمت و سطوت اور ایاز، مجبوری و محکومی کی علامت بن جاتا ہے تو کہیں یہ دونوں عاشق و معشوق کے علائم کی صورت اپنی جھلک دکھاتے ہیں، بعینہٖ علامہ اپنے تصورِ خودی سے ان تلمیحوں کا رشتہ قائم کر کے معنیِ مفید کا حصول کرتے ہیں:

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز — دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری (ب د،۲۶۱)
کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں — بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات (ب ج،۱۱۲)
فروفالِ محمود سے درگزر — خودی کو نگہ رکھ، ایازی نہ کر (ب ج،۱۲۸)
حاصل اس کا شکوۂ محمود — فطرت میں اگر نہ ہو ایازی (ض ک،۸۹)

اس ضمن میں شہاب الدین غوری کا اشاراتی ذکر قطب الدین ایبک کے ساتھ ہوتا ہے (رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی... ب د،۷۴) جب کہ تیمور اور نادر شاہ افشار کی جنگجویانہ سرشت کے پیشِ نظر، ان کی تلمیحیں ظلم اور بربریت کے استعاروں کی شکل میں نمود کرتی ہیں:

کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا — اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز
نادر نے لوٹی دلّی کی دولت — اک ضربِ شمشیر، افسانۂ کوتاہ! (ض ک،۱۶۶)

(ب) غیر اسلامی تاریخی تلمیحات:

کلامِ اقبال میں غیر اسلامی تاریخ کے پرشکوہ حکمرانوں اور معروف شخصیات پر مبنی وہ تلمیحات بھی نہایت اہمیت کی حامل ہیں جو قبلِ مسیح کے بعض اہم تاریخی کرداروں کے علاوہ دنیا کے مختلف خطوں کے ممتاز و ممیّز اشخاص و وقائع سے متعارف کراتی ہیں۔ اس سلسلے میں

جہاں اقبال قدیم یونانی، ایرانی، رومی چینی و ترکستانی اور ہندوستانی فرمانرواؤں کے تذکرے سے اپنی شاعری کو موثر و موثر بناتے ہیں، وہاں انھوں نے یورپ سے متعلق بعض انقلابی شخصیات کو بھی بڑی مہارت سے اپنے شعری تجربے کا حصہ بنایا ہے۔ چناں چہ شعرِ اقبال میں بیشتر مقامات پر علامہ اپنے اسلوبِ خاص سے غیر اسلامی دنیا کے ان متنوع تاریخی کرداروں کے قدر روایتی، دھندلے اور پرانے خاکوں میں تازہ اور اچھوتے رنگ بھرتے نظر آتے ہیں۔

تاریخ غیر مسلم کے ان مشاہیر میں اقبال سرزمینِ یونان کے فاتحِ جلیل، شاگردِ ارسطو، اسکندر اعظم یا اسکندر مقدونی (Alexander the great) کی جلالت و منزلت کو بطورِ تلمیح اپنے کلام کا حصہ بناتے ہیں، جس نے ایران میں دارا اور ہندوستان میں راجہ پورس کو عبرت ناک شکست دی۔ وہ دنیاوی جاہ و حشمت پر مبنی اس کردار اور اس سے وابستہ ''آئینۂ سکندری'' کی تلمیح کو اپنے افادی نقطۂ نظر کے تابع کر کے نئے معنی پیدا کر دیتے ہیں جس سے بیشتر مقامات پر تلمیح، علامت کی حدوں کو چھونے لگتی ہے:

نہیں ہے وابستہ زیرِ گردوں کمال شانِ سکندری سے — تمام ساماں ہے تیرے سینے میں، تو بھی آئینہ ساز ہو جا (ب د، ۱۲۹)

اسی خطا سے عتابِ ملوک ہے مجھ پر — کہ جانتا ہوں مآلِ سکندری کیا ہے (ب ج، ۴۸)

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے — یہ آدم گری ہے، وہ آئینہ سازی (''، ۱۴۶)

ایرانی حکمرانوں میں علامہ دارا، جمشید اردشیر بابکاں، نوشیروانِ عادل اور خسرو پرویز کی شان و شکوہ کی حامل تلمیحوں کو اپنے نقطۂ نظر کی ترسیل میں معاون ٹھہراتے ہیں۔ وہ دارا (Darus III) کی قوت و شوکت کا رشتہ اپنے تصوراتِ خودی و فقر سے جوڑ کر مسلمان کی قوتِ عمل کو مہمیز کرتے ہیں، جمشید کے ''جامِ جہاں نما'' کو شاہانہ تکلف کی علامت بنا کر متنوع انداز میں باندھتے ہیں، ایران میں ساسانی خاندان کے مؤسسِ جلیل اردشیر بابکاں کے سیاست و مذہب کے یکتائی کے تصور کو سراہتے ہیں، نوشیروانِ عادل (خسرو اول) ملقب بہ کسریٰ کے داد و انصاف کو عشق کی علامت بناتے ہیں اور ساسانی بادشاہ، پسرِ ہرمزد، خسرو پرویز (خسرو دوم) کو جاہ و جلال، طمطراق اور زر پرستی کا استعارہ بنا کر اپنے مطمحِ نظر کی ترسیل مؤثر انداز میں کرتے ہیں، اشعار ملاحظہ ہوں:

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں — پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا! (ا ج، ۱۵)

جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن — کسی جمشید کا ساغر نہیں میں (ب ج، ۸۶)

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی — کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری (ب ج، ۱۱۸)

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق — کبھی شاہِ شہاں، نوشیرواں عشق (ب ج، ۸۷)

بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی — کیا ہے اس نے فقیروں کو وارثِ پرویز (ب ج، ۱۶)

رومی حکمرانوں میں اقبال، جولیس سیزر کا خاص طور پر تذکرہ کرتے ہیں جس نے عوام میں اپنی مقبولیت اور سطوت کے سبب بڑے کرّ و فر سے حکومت کی اور بعد ازاں اٹلی میں مسولینی نے ''آلِ سیزر'' کو قیصریت یا سیزر کے اسی خواب کا احساس دلایا (توڑا اسکا

رومتہ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ+ آلِ سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب، ا ح۹) اسی طرح بسا اوقات علامہ ایرانی و رومی، اکاسرہ و قیاصرہ کو شوکت و طنطنے کی علامتیں بنا کر بیک وقت تلمیح کر دیتے ہیں جس سے ان کے کلام کا علامتی رنگ تقویت پکڑتا ہے، جیسے:

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے — وہ کیا تھا زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ (ب د،۲۷۰)

نہ ایراں میں رہے باقی نہ تووراں میں رہے باقی — وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ (ب ج،۲۳)

محبت خویشتن بینی، محبت خویشتن داری — محبت آستانِ قیصر و کسریٰ سے بے پروا (۲۵،")

چینی و ترکستانی خطوں کے اشخاصِ معروف کے ضمن میں اقبال فغفور خاقان کے القاب سے معروف قدیم ترین حکمرانوں کا تلمیحی تذکرہ بھی کرتے ہیں اور انھیں بادشاہت اور استعماریت کے کنائے کے طور پر بھی برتتے ہیں۔ انھی خطوں سے وابستہ چینی تاتار کے علاقے منگولیا کی خانہ بدوش اور خونخوار قوم کے خاقانِ اعظم، چنگیز خان کی جہانگیری و جہانداری کا ذکر بھی کلامِ اقبال میں ملتا ہے جس نے اپنے وضع کردہ قوانین و ضوابطِ حکمرانی سے کل تاتار اور چین پر تسلط جمایا۔ علامہ کے ہاں اس نسبت سے چنگیزیت، ظلم و تعدی کی علامت بن گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تاتار سے موسوم تاتاریوں کے اس دودمان کا تذکرہ بھی کرتے ہیں جس نے ایران پر حکمرانی کی اور ایلخان کہلایا اور جو بالآخر مسلمان ہوا، یوں عباسی سلطنت کو برباد کرنے والے چنگیز خان ہی کے خانوادے سے کعبے کی پاسبانی کرنے والے غیور مسلمان سامنے آئے۔ متذکرہ حوالوں کے ضمن میں اشعار دیکھیے:

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے — نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں (ا ح،۱۳)

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی (ب ج،۴۰)

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے — پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے (ب د،۲۰۶)

ہندوستان کی تلمیحات کے سلسلے میں اقبال، پنجاب کے راجہ پورس کی تلمیح فنائے اقتدار کے حوالے سے پیش کرتے ہیں، جسے اسکندر رومی (اسکندر اعظم) نے ایران کے دارا کو شکست دینے کے بعد جہلم کے نزدیک زوال سے ہمکنار کیا، اس تاریخی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں:

تاریخ کہہ رہی ہے یہ رومی کے سامنے — دعویٰ کیا جو پورس و دارا نے خام تھا (ب د،۲۴۱)

جہاں تک یورپ کی انقلابی شخصیات کا تعلق ہے، ان میں علامہ امریکہ کے دریافت کنندہ کرسٹوفر کولمبس، فرانس کے مدبر سیاس اور جلیل فاتح نپولین بوناپارٹ اور اطالوی محبِّ وطن مازنی کو جوشِ کردار اور جہدِ مسلسل کے اعتبار سے برمحل تلمیح کرتے ہیں۔ اسی تناظر میں وہ انقلابِ فرانس کو نگاہِ ستائش سے دیکھتے ہیں جس سے ان کے اپنے انقلابی مزاج کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے، شعر دیکھیے:

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں — ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں (ب د،۲۰۰)

راز ہے، راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز — جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز (ب ج،۱۴۹)

ہرے رہو وطنِ مازنی کے میدانو! جہاز پر سے تمھیں ہم سلام کرتے ہیں (ب د،۱۳۹)

چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں (ب ج،۹۹)

اقبال کی اسلامی و غیر اسلامی تاریخ کی یہ تلمیحات تاثیرِ شعری سے بھرپور ہیں اور ان کے تاریخی مطالعے پر دلالت کرنے کے ساتھ ساتھ شعرِ اقبال کو منفرد معنوی ابعاد عطا کرنے میں پیش پیش ہیں۔ علامہ کی تاریخی تلمیحوں میں آغاز سے انجام تک حسن و خوبی کے عناصر موجود ہیں اور یہ تلمیحیں صحیح معنوں میں ان کے اسلامی و غیر اسلامی تاریخی مطالعے کی تفہیم کی آئینہ دار ہیں۔ ان تلمیحات سے اقبال کی وسعتِ علمی اور بلاغتِ شعری کا موثر اظہار ہوا ہے۔ خاص طور پر جب وہ تاریخی تلمیحوں کا اطلاق حوادثِ نو پر کرتے ہیں تو ان کا شعری اسلوب نکھر جاتا ہے اور تلمیح محض صنائع لفظی میں شامل ایک صنعت نہیں رہتی بلکہ ایک کامل فن کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔

حوالے اور حواشی:

(۱) کزازی، میر جلال الدین بدیع (زیباشناسی سخن پارسی)، ص ۱۱۰

(۲) حالاں کہ یہ درست نہیں کیوں کہ تلمیح سے مراد ''افزودن نمک بہ طعام'' ہے، دیکھیے: واژہ نامۂ ہنرِ شاعری از میمنت میر صادق، ص ۸۳

(۳) فرہنگِ عمید، تہران: کتاب خانہ محمد حسن علمی ۱۳۴۳ھ، ص ۴۱۷

(۴) فرہنگ آنندراج، تہران: موسسہ انتشارات امیر کبیر ۱۹۸۴ء، ج ۲، ص ۱۱۸۶

(۵) فیروز اللغات فارسی از مولوی فیروز الدین، لاہور، فیروز سنز ۱۹۵۲ء، ص ۲۶۱

(۶) فرہنگِ تلمیحاتِ شعرِ معاصر از محمد حسین محمدی، تہران: نشر میترا، طبع اوّل ۱۳۷۴ھ، ص ۷

(۷) فنون بلاغت و صناعاتِ ادبی از جلال الدین ہمائی، تہران: انتشارات توس، طبع سوم ۱۳۶۴ھ، ج ۲، ص ۳۲۸

(۸) فرہنگِ جامع (فارسی۔انگلیسی) از سلیمان حییم، ج ۱، ص ۴۷۳

(۹) فرہنگِ تلمیحات از سیروس شمیسا، تہران: انتشارات فردوس، طبع چہارم ۱۳۷۳ھ، ص ۵

(۱۰) لغت نامہ دہخدا از علی اکبر دہخدا زیر نظر دکتر محمد معین، تہران: ۱۳۴۳ھ، شمارہ مسلسل ۱۰۲، شمارہ حرف 'ت': ۷، ص ۹۱۵

(۱۱) لطف اللہ کریمی: اصطلاحاتِ ادبی (انگلیسی۔فارسی)، ص ۲۵، ۲۶

(۱۲) میر صادقی: واژہ نامۂ ہنر شاعری، ص ۸۳

(۱۳) فقیر، شمس الدین: حدائق البلاغۃ (ترجمہ) امام بخش صہبائی، لکھنؤ: مطبع نولکشور، س ن، ص ۱۰۲

(۱۴) محمد عبید اللہ الاسعدی: تسہیل البلاغۃ، ص ۲۰۴، ۲۰۵

(۱۵) فرہنگِ صبا، ایران: انتشارات صبا، سال ۷۲، ص ۲۹۷

(۱۶) فیروز اللغاتِ فارسی، ص ۲۶۱

(۱۷) دانش نامۂ ادب فارسی (۲)، ایران: آسیای مرکز ۱۳۷۵ش، ج ۱، ص ۳۰۰

وحید الرحمٰن خان

اقبال اور جامی

کلام اقبال میں جن فارسی شعرا کا تذکرہ ملتا ہے ان میں ایک نام جامی کا بھی ہے۔ جامی کا پورا نام نور الدین عبدالرحمٰن تھا۔ وہ نظام الدین احمد دشتی کے فرزند تھے اور شمس الدین محمد دشتی اصفہانی کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ جامی جام کے مقام پر ۸۱۷ھ بمطابق ۱۴۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ جامی کا تخلص ان کے جائے ولادت کی نسبت سے ہے اور اس کی ایک نسبت شیخ الاسلام الناسقی جامی سے بھی ہے جس کی طرف جامی نے اپنے شعروں میں یوں اشارہ کیا ہے:

مولدم جام و رشحۂ قلمم　　جرعۂ ئی جام شیخ الاسلامی است
لاجرم در جریدۂ اشعار　　بدو معنی تخلص ام جامی است

جامی بچپن ہی سے نہایت ذہین و فطین تھے۔ عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم والدِ گرامی سے حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے نامور علمی و دینی ادارے مدرسۂ نظامیہ ہرات میں داخل ہوئے۔ حصول علم کے لیے سمرقند بھی گئے۔ اس تعلیمی سفر میں خواجہ سمرقندی، محمد جاجیروی اور فتح اللہ تبریزی سے کسبِ فیض کیا۔ اس دوران میں ان کا دلی میلان تصوف کی جانب ہوگیا اور وہ سعد الدین کاشغری، خواجہ علی سمرقندی اور قاضی زادہ رومی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے۔ ان کی شاعری میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ جامی نے شعر گوئی کے ساتھ ساتھ دین، ادب، تاریخ، حکمت اور تصوّف میں کمال پیدا کیا۔ جامی ایک کثیر التصانیف مصنف ہیں۔ ان تصانیف کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) تفسیر ناتمام (سورہ بقرہ)　　(۲) شواہد النبوت (سیرتِ مبارکہ)
(۳) اشعۃ اللمعات (شرح لمعات عراقی)　　(۴) لوامع (شرح قصیدۂ ثانیہ ابن فارض)
(۵) شرح بعض اشعار فارضیہ　　(۶) شرح رباعیات
(۷) نقد النصوص (شرح فصوص الحکم)　　(۸) لوائح (رباعیات مبنی بر مسئلہ وحدت الوجود)
(۹) شرح بیتے چند از مثنوی معنوی　　(۱۰) شرح حدیث ابی ذر غفاری
(۱۱) رسالہ فی الوجود　　(۱۲) ترجمہ و تشریح اربعین حدیث
(۱۳) رسالہ تہلیلیہ (تشریح کلمۂ توحید)　　(۱۴) مناقب خواجہ عبداللہ انصاری
(۱۵) رسالہ التحقیق مذہب صوفی (متکلم و حکیم)　　(۱۶) رسالہ مبنی بر سوال و جواب ہندوستان

(۱۷) رسالہ مناسک حج
(۱۸) ہفت اورنگ (مجموعہ مثنویات)
(۱۹) رسالہ در علم قافیہ
(۲۰) دیوانِ جامی (دیوان اوّل)
(۲۱) دیوانِ جامی (دیوانی ثانی)
(۲۲) دیوانِ جامی (دیوان ثالث)
(۲۳) بہارستان (بطرز گلستان سعدی)
(۲۴) رسالۂ کبیرہ در فن معمہ
(۲۵) رسالہ صغیرہ در فن معمہ
(۲۶) رسالہ متوسط در فن معمہ
(۲۷) رسالہ اصغر در فن معمہ
(۲۸) رسالہ در فن عروض
(۲۹) شرح بعض ابیات مثنوی معنوی
(۳۰) شرح فصوص الحکم
(۳۱) منشائتِ جامی
(۳۲) فوائد الضیائیہ فی شرح کافیہ
(۳۳) رسالہ طریق صوفیاں
(۳۴) نفحات الانس
(۳۵) شرح چند ابیات امیر خسرو دہلوی
(۳۶) مناقب مولوی معنوی
(۳۷) رسالہ در فن موسیقی
(۳۸) سخنان خواجہ پارسا

''نفحات الانس'' جو صوفیہ کا تذکرہ ہے، جامی کا اہم ترین علمی کارنامہ ہے۔ جامی کی شاعری میں شعرائے سلف کی سی تاثیر ہے۔ خصوصاً ان کی غزل پر سعدی، حافظ اور امیر خسرو کے اثرات ہیں۔ انھوں نے شاعری میں مضامینِ تصوف کو نہایت لطیف اور دل پذیر انداز میں بیان کیا ہے۔ جامی حصولِ مال و متاع سے بے نیاز تھے اس لیے قصیدے کی جانب انھوں نے زیادہ توجہ نہیں کی۔ اس کے برعکس انھوں نے منعم حقیقی کی مدح سرائی کی۔ ان کی حمدیہ اور نعتیہ شاعری نہایت اثر آفرین ہے۔ انھیں رسول اکرمؐ سے حد درجہ محبت تھی اور مدحتِ پیغمبر کرتے ہوئے ان کے ہاں وارفتگی اور شیفتگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اقبال نے جامی کے عشقِ رسول کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ جامی نے ۸۹۸ھ بمطابق ۱۴۹۲ء میں ہرات میں وفات پائی۔ (مقدمہ کلیاتِ جامی)

مولانا جامی کو حضور اکرمؐ کی ذاتِ گرامی سے حد درجہ عشق تھا اور ان کی شاعری میں اس جذبے کی خوشبو رچی بسی ہے۔ جامی کے کلام میں حضورؐ سے والہانہ عقیدت کا اظہار نمایاں ہے۔ یہی خصوصیت کلامِ اقبال میں بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ ''جامی نے عشقِ رسولؐ میں بہت پرسوز شعر کہے ہیں۔ یہ مضمون جامی اور اقبال دونوں میں مشترک ہے۔'' (اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ص ۴۵۲)

جامی کی طرح اقبال کے کلام سے بھی آنحضرتؐ سے عقیدت اور شیفتگی ظاہر ہوتی ہے۔ عرشی امرت سری نے دونوں شاعروں کی اس قدرِ مشترک میں ایک فرق بیان کیا ہے جو دراصل جذبے کے دو مختلف رنگوں کی عکاسی کرتا ہے۔ عرشی کے مطابق:

> ''جامی و اقبال میں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ جامی کا قدم اپنی داخلی دنیا سے باہر نہیں نکلا۔ وہ پیغمبرؐ کے حضور تنہا جانے کے لیے بے تاب ہیں۔ انھیں محبوبؐ کے سوا کسی سے واسطہ نہیں لیکن اقبال پوری امت کو اپنے دامن میں لیے ہوئے، حضورؐ کے دروازے پر حاضر ہوتے ہیں۔ ان کی دیوانگی میں ادب ملحوظ رہتا ہے اور فریاد میں پوری قوم کی ترجمانی پیش نظر رہتی ہے۔''

(اقبال۔ پیامبر امید، ص ۱۱۸)

اقبال، جامی کو ایک شاعر سے زیادہ ایک عاشق کے طور پر پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ایک ایسا عاشق جس کا دل محبوب عالمؐ کی یاد میں ہمہ وقت دھڑکتا ہے۔ سید عبداللہ نے اس حوالے سے لکھا ہے:

''گمان غالب یہ ہے کہ علامہ کو جامی کی غزل میں کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی بلکہ ان کی صوفیانہ نظم ونثر انھیں مرغوب تھی۔ محض بہ طورِ شاعران کی رائے یہ ہے:

نایاب نہیں متاعِ گفتار　　صد انوری و ہزار جامی''

(بحث ونظر، ص ۲۸۷)

اقبال نے اپنی شاعری میں دو تین مقامات پر ستائشی انداز میں مولانا جامی کا براہِ راست تذکرہ کیا ہے۔ ''اسرارِ خودی'' میں در بیان اینکہ خودی از عشق ومحبت استحکام می پذیرد'' کے عنوان کے تحت جامی کے ایک شعر کو تضمین کرتے ہوئے جامی کے جذبۂ عشق کو سراہا گیا ہے:

کشتۂ اندازِ مُلّا جامیم　　نظم و نثرِ او علاجِ خامیم

شعر لب ریزِ معانی گفتہ است　　در ثنائے خواجہ گوہر خفتہ است

''نسخۂ کونین را دیباچہ اوست　　جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست''

(اسرارِ خودی، ص ۲۱)

اقبال نے جامی کو عشق کی علامت کے طور پر بھی دیکھا ہے، عشق جو سوز، تڑپ اور تپش جیسی کیفیات کا آئینہ دار ہے اور عقل اور منطق سے بالاتر ہے۔ ذیل میں اقبال کی دو بیتیاں نقل کی جارہی ہیں جن میں ان جذبات کا اظہار ملتا ہے:

گہے شعرِ عراقی را بخوانم　　گہے جامی زند آتش بجانم

ندانم گرچہ آہنگِ عرب را　　شریکِ نغمہ ہائے سارِبانم

(ارمغانِ حجاز، ص ۲۸)

مرا از منطق آید بوے خامی　　دلیل او دلیلِ ناتمامی

بہ رُومیم بستہ درہا را کشاید　　دو بیت از پیرِ رومی یا ز جامی

(ارمغانِ حجاز، ص ۱۳۲)

علامہ کی نثری تحریروں میں بھی مولانا جامی کا تذکرہ ملتا ہے۔ اقبال نے مولانا گرامی کے نام جو خط تحریر کیے ہیں، ان میں دو تین بار جامی کا ذکر آیا ہے۔ یہ ذکر ہم ذوقی، ہم سخنی اور مشورۂ سخن کے تحت آیا ہے۔ ایک خط میں اقبال رقم طراز ہیں:

''کل مولانا جامی کا ایک نہایت مزے دار مطلع نظر پڑا، یعنی:

آن کہ از حلقۂ زرگوش گران است او را　　چہ غم از نالۂ خونین جگران است او را

بہت فکر کی کہ ایسا مطلع نکل سکے مگر مندرجہ ذیل ملاحظہ فرمایئے اور اپنے مشورے سے بھی آگاہ کیجیے:

باز گوید صنم ار تاب مقالش بخشند — گلہ ہاے کہ ز ہندو پسران است او را
یارب از غارتِ گل بردلِ نرگس چہ گذشت — دست بے طاقت و چشم نگران است او را"

(کلیاتِ مکاتیبِ قبال، ص ۶۴۵)

اسی طرح ایک خط میں شعر کی سند کے معاملے میں لکھتے ہیں:

"مولانا جامی کا شعر آپ نے خوب نکالا۔"

(کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، ص ۳۳۱)

ایک اور خط میں جامی کا ذکر یوں ہوا ہے:

"مولانا جامی کی غزل پر جو دو شعر آپ نے لکھے ہیں، لاجواب ہیں اور بالخصوص آں یک اندیش
الخ سبحان اللہ!"

(کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، ص ۴۴۵، ۴۴۶)

مظفر حسین برنی کے مطابق گرامی کا مکمل شعر یوں ہے:

گرد ازینم نظرِ خیبرِ کفرم بہ دونیم — آں یک اندیش کہ تیغِ دو زبانست او را

(کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، ص ۴۴۶)

برنی نے مزید لکھا ہے: "یہ پوری منقبت دیوانِ گرامی میں موجود ہے۔" (کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، ص ۴۴۶)
یہاں برنی سے معمولی سے فروگزاشت ہوئی ہے، یہ منقبت نہیں، نعت ہے جس کا مطلع یہ ہے:

آنکہ راہے نہ نہاں خانۂ جانست او را — بے نشانست و بہ ہر ذرّہ نشانست او را

(دیوانِ گرامی، ص ۲)

اقبال اور گرامی میں ذوقِ شعر کی قدر مشترک ہے۔ دونوں کے درمیان مشورۂ سخن اور تبادلۂ اشعار بھی ہوتا تھا۔ مکاتیب میں اسی ذہنی روش کے تحت جامی کو یاد کیا گیا ہے۔

جامی اور اقبال کے کلام میں جہاں عشق رسولؐ ایک مشترک قدر کے طور پر نمایاں ہوتی ہے وہاں چند مقامات پر ایک اور قدر مشترک ہوتی نظر آتی ہے۔ یہ اشتراک فنی سطح پر قائم ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمد ریاض نے جامی کی چند ایسی غزلوں کی نشان دہی کی ہے جن کی زمینوں میں اقبال نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ (اقبال اور فارسی شعرا، ص ۱۹۶ تا ۱۹۹) ذیل میں یہ شعری اشتراکات درج کیے جا رہے ہیں:

جامی: اصحبت زائراً لک یا شحنۃ النجف — بہر نثار مقدم تو نقد جان بکف

(کلیاتِ دیوانِ جامی، ص ۲۵)

اقبال: میر سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف
آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف
(بالِ جبریل، ص۳۹)

جامی: طرفِ باغ ولبِ جوے ولبِ جامست اینجا
ساقیا خیز کہ پرہیز حرامست اینجا
(کلیاتِ دیوانِ جامی، ص۸۵)

اقبال: ہست این میکدہ و دعوتِ عام است اینجا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است اینجا
(پیامِ مشرق، ص۱۲۴)

جامی: ریزم ز مژہ کوکب بی ماہِ رخت شبہا
تاریک شبے دارم با این ہمہ کوکب ہا
(کلیاتِ دیوانِ جامی، ص۶۷)

اقبال: من ہیچ نمی ترسم از حادثۂ شب ہا
شب ہا کہ سحر گردد از گردشِ کوکب ہا
(زبورِ عجم، ص۱۱۷)

جامی: من و فکر تو چہ بینم بہ جمالِ دگران
ہم خیالِ تو مرا بہ ز وصالِ دگران
(کلیاتِ دیوانِ جامی، ص۳۹۹)

اقبال: مثلِ آئینہ مشو محوِ جمالِ دگران
از دل و دیدہ فرو شوے خیالِ دگران
(پیامِ مشرق، ص۱۷۴)

واضح رہے کہ جامی سے قبل کے فارسی شعرا نے بھی ان زمینوں میں غزلیں کہی ہیں۔ لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اقبال نے امی کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا تھا جس کے اثرات ان کے اپنے کلام سے ظاہر ہیں۔

کتابیات:

(۱) احسن، عبدالشکور، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷ء
(۲) جامی، عبدالرحمٰن، کلیات دیوانِ جامی، تہران، انتشاراتِ ہدایت، دیماہ ۶۲ (جامی کی زندگی اور شاعری کے بارے میں معلومات شمس صدیقی بریلوی کے مقدمے سے حاصل کی گئی ہیں۔
(۳) سید عبداللہ، بحث ونظر، م ن، س ن۔
(۴) عرشی امرتسری، علامہ، اقبال۔ پیامبر امید (مرتبہ: ڈاکٹر تصدق حسین راجا) لاہور: فیروز سنز، ۱۹۹۰ء۔
(۵) محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال (اردو)، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز۔
(۶) محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال، (فارسی) لاہور، شیخ غلام علی، ۱۹۹۰ء۔
(۷) محمد ریاض، ڈاکٹر، اقبال اور فارسی شعرا، لاہور، اقبال اکادمی، پاکستان، ۱۹۷۷ء
(۸) مظفر حسین برنی، سید (مرتب) کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، جلد:۲، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۹۳ء

طاہرہ صدیقہ☆

اقبال شناسی میں خواتین کا کردار

علامہ اقبال بیسویں صدی کی نامور شخصیات میں سے ہیں جن کی حیات ہی میں ان کے افکار کو عالمی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی۔ ان کے پیش کردہ تصور کی اساس پر دنیا میں ایک نظریاتی مملکت کا قیام عمل میں آیا۔ بحیثیت ایک فلسفی شاعر اقبال کے افکار آفاقی قدروں کے حامل ہیں۔ اہل علم و دانش کی جانب سے اقبال کے فلسفے اور شاعری کی جانب جس توجہ اور دلچسپی کا اظہار اُن کی حیات کے دوران ہوا تھا، اس کا سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ اس کا ثبوت آئے دن شائع ہونے والے مقالات اور کتب ہیں جو شاعرِ مشرق کی شاعری کا احاطہ کرتی ہیں۔ ہنوز اقبال پر تحقیق و توضیح کا سلسلہ جاری ہے اور علمی و ادبی اور فکری دنیا میں اقبال شناسی ایک عالمی روایت کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔

امریکہ، یورپ اور روس میں کلامِ اقبال کے تراجم ہو چکے ہیں۔ اسی طرح دنیا کی تمام بڑی بڑی زبانوں جیسے انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، اطالوی، روسی، چینی، ترکی اور فارسی وغیرہ میں اقبال پر کتابیں اور مقالات قلم بند کیے جا چکے ہیں۔ خود اقبال اپنے بارے میں کہہ چکے ہیں:

زیارت گاہ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

یہ محض ایک شاعرانہ تعلّی نہیں۔ بلاشبہ اقبال کی شاعری اور نادر افکار محض اپنے عہد تک ہی محدود نہ تھے بلکہ انھوں نے ایسی صداقتوں کو بیان کیا جن کی اہمیت ہر دور میں برقرار رہے گی۔ کیوں کہ ان کا پیغام جغرافیائی حدود اور مذہبی عقائد کی قیود سے آزاد ہے۔ آج قومی و بین الاقوامی ہر دو سطحوں پر اقبال شناسوں کا علامہ اقبال کو خراجِ تحسین پیش کرنا گویا اس کی عملی توثیق ہے کہ واقعی انھوں نے لاہور سے تا بخاک بخارا و سمرقند اک ولولہ تازہ دلوں کو دیا ہے۔

اس مقالے کا موضوع ''اقبال شناسی میں خواتین کا کردار'' اس لحاظ سے اچھوتا ہے کہ اقبال شناسی کے ضمن میں مرد حضرات کی خدمات کا انفرادی و اجتماعی جائزہ مختلف مقالہ جات و کتب میں لیا جا چکا ہے مگر اقبال شناسی کے اس میدان میں محض چند خواتین کے کام

☆ C/O، خواجہ عبدالمنان، نیشنل بینک، ریجنل کمپیوٹر سینٹر بینک اسکوائر، نانگی میر پور، آزاد کشمیر

کوانفرادی طور پر سراہا گیا۔ مجموعی طور پر خواتین کے تحقیقی وتنقیدی خدمات کا جائزہ نہیں لیا گیا نتیجتاً خواتین بحیثیت اقبال شناس پردۂ اخفا میں ہی پڑی رہ گئیں اوران کے کام کووہ پذیرائی نہ مل سکی جس کی وہ قرار واقعی مستحق تھیں۔اس مقالے میں اس عام غلط فہمی کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خواتین نے اقبال شناسی کے میدان میں کوئی خاص قابل ذکر کام نہیں کیا۔

اس مقالے میں خواتین اقبال شناسوں کی باآسانی دستیاب شدہ تصانیف کوسنین وارتین ادوار میں منقسم کرکے ان کی خدمات کا جائزہ الگ الگ لیا گیا ہے۔

پہلا دور ۱۹۴۶ء سے ۱۹۷۰ء تک کی خواتین اقبال شناسوں کی تصانیف پر مشتمل ہے۔رضیہ بانو فرحت کی مرتبہ ''خطباتِ اقبال'' جو دہلی سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی اقبال شناسی کے میدان میں کسی خاتون کی پیش کردہ پہلی تالیف ہے۔فرانسیسی متشرق خاتون لوس کلوڈ قیخ نے ۱۹۵۵ء میں علامہ اقبال کے فلسفیانہ تصورات کی توضیح پر مبنی کتاب "Introduction's La Pensee D.Iqbal" لکھی جو پیرس سے شائع ہوئی۔۹۳ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مصنفہ نے اختصار کے باوجود فکرِ اقبال کے اہم ترین گوشے منور کیے ہیں۔اس کا انگریزی ترجمہ عبدالمجید ڈار اور اُردو میں ڈاکٹر سلیم اختر نے ''فکرِ اقبال کا تعارف'' کے عنوان کے تحت کیا۔یہ اردو ترجمہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے اکتوبر ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔عطیہ بیگم نے ہائیڈل برگ (جرمنی) میں قیام کے دوران اقبال کی یادوں اوران کے خطوط کو انگریزی زبان میں کتاب کی شکل میں شائع کرایا۔اس کا ترجمہ ضیاء الدین برنی نے کیا اور یہ کتاب اقبال اکادمی پاکستان لاہور سے تین بار طبع ہوچکی ہے۔پہلی بار یہ کتاب ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی، دوسری بار ۱۹۶۹ء میں اور تیسری بار ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ''اقبال'' کے حوالے سے عطیہ بیگم کی یادداشتوں پر مشتمل ایک ڈائری کی حیثیت رکھتی ہے اور عطیہ بیگم کے ذاتی تاثرات کی بنا پر ایک منفرد حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ یہ اپریل ۱۹۰۷ء سے ۴ر ستمبر ۱۹۰۷ء تک کے واقعات پر محیط ہے۔اس کتاب سے اقبال کی شخصیت کے ظاہری و باطنی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ان کی شخصیت کے بہت سے پہلو جیسے بذلہ سنجی، برجستگی اور حسِ مزاح سامنے آتے ہیں۔اقبال کو محض ایک فلسفی، مفکر اور شاعر مانا جاتا ہے مگر عطیہ بیگم کے نام لکھے گئے کم وبیش بارہ خطوط، یادداشتوں اوران کے تاثرات سے اقبال کا انسانی پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔وہ ایک ایسے انسان دکھائی دیتے ہیں جس کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل موجود ہے جو حسن اور ذہانتِ نسوانی سے متاثر ہوتا ہے۔

مشرقی زبانوں، اسلام، تصوف اور اقبال سے والہانہ شغف رکھنے والی مغربی جرمن نامور متشرق اور اقبال شناس خاتون ڈاکٹر این میری شمل نے مغربی دنیا کو اقبال سے روشناس کرانے میں تنہا جو کردار ادا کیا ہے، وہ تعداد اور معیار کے اعتبار سے بڑے بڑے علمی اداروں پر بھاری ہے۔ڈاکٹر شمل نے ''جاوید نامہ'' کا ۱۹۵۸ء میں جرمن زبان میں ترجمہ کیا اوراس کے علاوہ فکر اقبال کی تشریح وتوضیح پر جو گرانقدر مقالات قلم بند کیے، ان میں موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ فکر کی گہرائی بھی ملتی ہے انھوں نے اقبال پر متعدد مقالات کے علاوہ دو کتب بعنوان "Gabriel's & wing" اور "Muhammad Iqbal Poet

"and Philosopher بھی تحریر کی ہیں۔ شمل کی یہ تصانیف اوّل سے آخر تک کلامِ اقبال اور فکرِ اقبال کے ساتھ ان کی دلچسپی کی داستان سناتی ہیں۔ اقبال کے دینی افکار کے مبسوط مطالعہ پر مبنی "Gabriel's & Wing" کو اقبال پر لکھی گئی بہترین تصنیف قرار دیا گیا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۲ء میں ہالینڈ سے شائع ہوئی اور مغرب میں اسے بے حد پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کتاب کی اہمیت کے پیشِ نظر پاکستان کے ڈاکٹر محمد ریاض نے اسے ''شہپرِ اقبال'' کے عنوان کے تحت اردو زبان کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اس کتاب میں اقبال کے مذہبی افکار کو اسلام کے اساسی عقائد اور ایمان مفضل کی ترتیب سے پیش کر کے مصنفہ نے اپنی جدّت اور ندرت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس سے قبل اقبال پر اس انداز کی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اگرچہ یہ کتاب اقبال کے مذہبی افکار سے متعلق ہے مگر اقبال کی شاعری پر کام کرنے والوں کے لیے بھی اس میں نہایت مفید نکات موجود ہیں۔ بلاشبہ ڈاکٹر این میری شمل کا شمار اوّلین صف کے اقبال شناسوں میں ہوتا ہے:

ڈاکٹر جمیلہ خاتون کی اقبال کے فلسفے پر انگریزی تصنیف "The Place of God, Man and Universe in the Philosophic system of Iqbal" اقبال اکادمی پاکستان، لاہور سے پہلی بار ۱۹۶۳ء اور تیسری بار ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی۔ مصنفہ نے اقبال کے تمام تر فلسفے کی بنیاد کو خدا، انسان اور کائنات کے متعلق تصور پر مشتمل قرار دیا ہے اور اقبال کے فلسفیانہ افکار کی روشنی میں خدا، انسان اور کائنات کے تصور پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ کتاب بنیادی طور پر خدا اور کائنات کے متعلق علمی تصورات کے ساتھ ساتھ اقبال کے فلسفے کی مدد سے ایک تفہیم فراہم کرتی ہے۔ مصنفہ نے اقبال کے فلسفیانہ نظام میں سے (تین) خدا، انسان اور کائنات کا انتخاب یہ تجزیہ کرنے کے لیے کیا ہے کہ مشرق و مغرب کے فلسفیوں نے انھیں کس سطح پر رکھا ہے۔ جیسا کہ مصنفہ نے کتاب میں یہ بیان کیا ہے کہ اقبال مذہبی خیالات اور مغربی (فکر) مابعد الطبیعیات سے متاثر تھے مگر وہ مشرقی و مغربی فلسفیوں کے مقابلے میں منفرد مقام کے حامل ہیں۔ اسی لیے ان کا فلسفے کے خزانے میں اضافہ منفرد اور غیر معمولی ہے۔ ڈاکٹر جمیلہ خاتون کی اقبال کے فلسفیانہ افکار پر مبنی یہ تصنیف اقبال شناسی کے میدان میں انھیں اوّلین صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔

دوسرے دور ۱۹۷۱ء سے ۲۰۰۰ء تک میں جن خواتین اقبال شناسوں کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے ان میں شاعرہ اور صدر آل انڈیا زنانہ مسلم لیگ سیدہ سردار بیگم اختر بھی شامل ہیں، جن کا دلکش کلام ''سیدہ اختر و اقبال'' (تضمین بر کلام اقبال) زہرہ سخن اکیڈمی، بنگلور سے نومبر ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں سیدہ اختر نے اقبال کے کلام پر تضمین کے حوالے سے شاعرِ مشرق کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں سیدہ اختر کے بارے میں جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، ماہر القادری، سیماب اکبرآبادی اور نیاز فتح پوری کی آرا بھی شامل ہیں۔ جنھوں نے سیدہ اختر کی شاعری، خطابت اور دیگر قومی و ملکی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

ڈاکٹر پروین شوکت علی نے تحقیقی مقالہ بعنوان ''اقبال کا فلسفہ سیاسیات'' انگریزی زبان میں تحریر کیا تھا، جس پر انھیں ۱۹۶۸ء میں

پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی۔ بعدازاں اس کا اردو ترجمہ مولانا ریاض الحق عباسی نے کیا اور یہ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور سے ۱۹۷۷ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

اقبال کا فلسفہ اور شاعری بہت سے اربابِ قلم کا موضوع نگارش بنا لیکن ان کے سیاسی نظریات کا تنظیم و ترتیب کے ساتھ مذہبی اور فلسفیانہ تصورات پسندی کے ساتھ اس حد تک جائزہ نہیں لیا گیا جہاں تک کہ اس کی اہمیت کا اقتضا تھا۔ ڈاکٹر پروین شوکت علی کا یہ مقالہ اس خلا کو پورا کرنے کی ایک کامیاب کاوش ہے۔ اس مقالے کا مدعائے نگارش یہ ہے کہ فکریاتِ اقبال میں سیاسی تصورات و نظام تفکر کے اصولی عناصر کو مقامِ تحقیق و اکتشاف میں لا کر تنقیدی طور پر ان کی اہمیت کو وضاحت آشنا کیا جائے۔ جن میں اللہ کی حاکمیت، انسان کی مثالی قیادت کے لیے منصب نبوت، اجتہاد یعنی آزادانہ استدلال، قومیت، اشتمالیت، جمہوریت، خودی مومن اور ملت کی سیاسی اہمیت شامل ہے۔ مصنفہ نے اس تحقیقی مقالے میں اقبال کے تصورِ ریاست، فرد اور ریاست کے مابین رابطہ کی نوعیت اور قانون کا ماخذ اور اس کی نوعیت پر سیر حاصل بحث کے بعد یہ رائے قائم کی کہ اقبال علمی اربابِ سیاست کی فہرست میں نہ تھے لیکن انھیں فلسفی سیاست دان کہا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ اسلامی نظریۂ سیاست کے بنیادی اصول کی تجدید و احیاء کے لیے اقبال نے جو خدمات انجام دی ہیں، انھیں بھی منظر تحقیق پر لایا جائے چناں چہ مصنفہ کے نزدیک مختلف مسائل سیاست کی رمز آشنائی میں اقبال کی استدلالی روش کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں اسلام کے عظیم سیاسی فلسفیوں کی صف میں مسند امتیاز کا مستحق تصور کیا جائے۔

پروفیسر آل احمد سرور اقبال کے قدر شناسوں اور پرستاروں میں نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ انھوں نے اقبال کے کلام کا بالاستعیاب مطالعہ کیا جس کا ثبوت ''عرفانِ اقبال'' میں شامل وہ عالمانہ تحریریں ہیں جو وقتاً فوقتاً اُن کے معجز رقم قلم سے نکلیں اور اب کتابی صورت میں یکجا ہو کر منصۂ شہود میں آ چکی ہیں۔ زہرا معین نے ان مضامین کو یکجا کر کے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب تخلیق مرکز شاہ عالم مارکیٹ، لاہور سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔ ان کی یہ کاوش لائق صد تحسین ہے کیوں کہ سرور صاحب کے ان مضامین کے مطالعے سے اقبال کے پیغام کی روح اور ان کے فن کے رمز و ایما سے آشنا ہونے میں مدد ملتی ہے۔

مسز کشور اقبال کی کتاب ''فکرِ اقبال کے تعلیمی تقاضے'' گلوب پبلشرز اردو بازار، لاہور (سن ندارد) میں اقبال کے تعلیمی افکار کا مطالعہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اقبال کے تصورات کو نظامِ تعلیم کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چھ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں مصنفہ نے نظامِ تعلیم کے حوالے سے فکر اقبال کے بنیادی تصورات کا جائزہ لیا، فکر اقبال کے بنیادی تصورات کے تعلیمی مضمرات متعین کیے اور ان مقاصد کی روشنی میں پاکستان کے نظامِ تعلیم کی اصلاح و بہتری کے لیے تجاویز پیش کیں ہیں۔

شمیم حیات سیال کی مرتبہ کتاب ''اقبال بڑا اُپدیشک'' آئینہ ادب لاہور سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مرتبہ نے مختلف کتب اور خطوطِ اقبال سے حیات و شخصیت اقبال کے مختلف مرقعے مختصر اقتباسات کی صورت میں منتخب کر کے

جمع کیے ہیں اور اقبال کے خطبات و تقاریر اور ملفوظات وغیرہ سے بھی اقتباسات جمع کیے ہیں، جن کی کل تعداد ۱۵۳ ہے۔ ہمارے یہاں اقبال شناسی کی فہرست میں اپنا نام شامل کرنے کی غرض سے ادھر اُدھر سے مضامین جمع کر کے کتاب شائع کرنے کا رجحان عام ہو چکا ہے، یہ کتاب بھی اسی رجحان کے تحت مرتب کی گئی ہے۔ شمیم حیات سیال ہی نے اپنے والد محمد حیات سیال کے ساتھ مل کر ایک اور کتاب ''اقبال غیر مسلموں کی نظر میں'' بھی مرتب کی جو مکتبہ شاہکار اردو بازار، لاہور سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ۲۱ مضامین کے انتخاب پر مشتمل ہے جو غیر مسلم دانشوروں نے اقبال کی شخصیت اور شاعری پر مختلف اوقات میں لکھے تھے۔ ان میں ڈاکٹر نکلسن، ڈاکٹر بوسانی، این میری شمل، جگن ناتھ آزاد، رابندر ناتھ ٹیگور اور سر تیج بہادر سپرو کے مضامین نمایاں ہیں۔ سلطانہ مہر کی مرتبہ کتاب ''اقبال دور جدید کی آواز'' ادارہ تحریر، کراچی سے دسمبر ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔ کتاب میں کل بارہ مضامین شامل ہیں جو اقبال کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں کا نہایت خوبصورتی، اختصار اور جامعیت کے ساتھ احاطہ کرتے ہیں مولفہ نے کتاب کے آخر میں اپنا چھ صفحات پر مشتمل مضمون ''علی گڑھ تحریک میں اقبال کا حصہ'' بھی شامل کیا ہے۔ وہ علی گڑھ تحریک کی ضرورت اور اقبال کے نامکمل مشن کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ علی گڑھ تحریک اور اقبال کے مشن یعنی روشن خیالی کی تحریک اور رجعت پسندی کے خلاف مشن کو نئے سرے سے جاری کیا جائے۔ ڈاکٹر نسرین اختر کی تصنیف ''اقبال اور وجودِ زن'' ادارہ تحقیق تصنیف پاکستان لاہور سے دسمبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی۔ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب کو چھ ابواب میں منقسم کر کے مصنفہ نے علامہ اقبال کے اشعار و افکار کی روشنی میں عورت کی عظمت کو واضح کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اقبال نے مسلمان عورت کو جو تعلیم دی ہے، اسے تفصیل کے ساتھ قوم کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے سامنے پیش کرنے کی ہے تا کہ وہ اقبال کی تعلیمات کو مشعلِ راہ بنا سکیں جس میں اسلام کی صحیح روح پنہاں ہے۔ بیگم ثاقبہ رحیم الدین کا مقالہ ''دائمی تحرک اور اجتہادِ فکر و عمل کا شاعر'' کتابی صورت میں اقبال اکادمی، لاہور سے ۹ نومبر ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ مصنفہ نے اس مختصر مقالے میں شاعر انسانیت، دائمی تحرک اور اجتہادِ فکر و عمل کا شاعر قرار دیتے ہوئے یہ بیان کیا ہے کہ ان کے اشعار ہماری موجودہ سوچ اور فکر کے لیے تازیانہ ہیں اور ہمارے زندہ ہونے کے احساس کو بیدار کرتے ہیں۔ اقبال کے دائمی تحرک اور اجتہادِ فکر و عمل کے فلسفے کی روشنی میں لکھتی ہیں کہ فرد اور قوم کی تعمیر و ترقی کا راز اعلیٰ صلاحیتوں کے نکھار اور مسلسل سخت محنت میں۔ لہٰذا ہمیں فلاح اور ترقی کی منزل تک پہنچنے کے لیے بے یقینی اور سہل انگاری کی دھند کو ہٹا کر راستہ بنانا ہے۔

۱۹۸۳ء میں فرحان پبلشرز، لاہور سے شائع ہونے والی کتاب ''علامہ اقبال'' (افکار و خیالات) میں مرتبین تسنیم کوثر گیلانی اور مصباح الحق صدیقی نے علامہ اقبال کے صد سالہ جشن کے سلسلے میں لکھے گئے مضامین پرانے اخبارات و رسائل سے مرتب کر کے کتابی شکل میں پیش کیے۔ دیگر مضامین کے علاوہ اقبال کا بہت نایاب مضمون ''سودیشی تحریک اور راہبرانِ اسلام'' بھی کتاب میں شامل کیا گیا۔

ہمارے یہاں عموماً وہ شخصیات یا افراد جو قوموں کی تقدیر بن کر اُبھرتے ہیں ان کے بچپن اور زندگی کے ابتدائی دور پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ حالاں کہ یہ وہ دور ہے جس کی تفصیل اگلی نسل تک منتقل کی جائے تو زیرِ تربیت بچوں کی ذہنی نشوونما اور تعلیم و شعور کے لیے ایک اہم عنصر بن سکتی ہے۔ فرزانہ یاسمین کی کتاب ''اقبال کا بچپن'' (۱۹۸۳ء) اسی ضرورت کے احساس کا نتیجہ ہے۔ مروج معانی میں بچپن عمر کا اولین اور ابتدائی دور سمجھا جاتا ہے لیکن فرزانہ یاسمین نے اسے طالب علمی کے دور تک شمار کیا ہے اور لفظ ''بچپن'' کو اصطلاحی طور پر اور زیادہ وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں ۱۴ عنوانات کے تحت علامہ اقبال کے دور طالب علمی اور پھر انگلستان سے واپسی پر اپنی والدہ کی آغوش میں واپسی کے حالات بیان کیے ہیں۔

اقبال کی قومی شاعری کا دور ایک تحقیقی اور تجزیاتی مطالعے کا تقاضا کرتا ہے۔ کیوں کہ اس مطالعے سے ان کی شخصیت اور فکر کے کئی ایسے گوشے ہمارے سامنے بے نقاب ہوئے ہیں، جن کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

ڈاکٹر شمیم ملک کی کتاب ''اقبال کی قومی شاعری'' مقبول اکیڈمی، لاہور سے ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی۔ ۲۲۱ صفحات پر مشتمل اس تصنیف میں علامہ اقبال کی قومی شاعری کے تحقیقی و تجزیاتی مطالعے میں تحقیق اور تنقید دونوں کی پیش نظر رکھا ہے اور اردو میں قومی شاعری کی روایت کے پس منظر میں علامہ اقبال کی قومی شاعری کے خدوخال کو بڑے سلیقے سے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کے ابتدائی تین ابواب اصل موضوع کے پس منظر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مصنفہ نے سب سے پہلے لفظ ''قومی'' کے مفہوم کا سراغ لگایا ہے اور اس کے معنوی حدود متعین کی ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے دوسرے باب میں اردو شاعری میں قومیت کے تصور اور اس کے ارتقا کا جائزہ لیا ہے۔ تیسرے باب میں ''قومی شاعری کے اہم نمائندے'' کے عنوان کے تحت ابتدا سے لے کر اس زمانے تک قومی شاعر کے اہم علم برداروں کا تذکرہ کیا ہے۔ چوتھے باب میں اقبال کی شاعری کے پہلے دور کا نہایت متوازن تنقیدی تجزیہ کیا ہے۔ پانچویں باب میں اقبال کی شاعری کے دوسرے اور تیسرے دور کی قومی شاعری پر بحث کی گئی ہے۔ چھٹے اور آخری باب میں دوسرے قومی شعرا کو سامنے رکھ کر قومی شاعری کی روایت میں اقبال کا مرتبہ متعین کیا گیا ہے۔

لطیفہ خانم اور محمد عظیم ملک کی تصنیف ''عکسِ اقبال'' مکتبہ میری لائبریری، لاہور سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔ ۲۱۵ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ۱۹ مقالات شامل ہیں۔ اقبال کی تمام تصانیف نظم و نثر کا ایک مختصر سی کتاب میں تنقیدی تجزیہ پیش کرنا بلاشبہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ مصنفین کے لکھے گئے تمام مقالات بہت مختصر ہیں اور اپنی اپنی جگہ بہت اہم ہیں۔ تمام مقالات میں اقبال کے کسی نہ کسی پیغام یا فلسفے کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ زیادہ بہتر یہ تھا کہ کتاب کے مندرجات میں وضاحت کر دی جاتی ہے کہ فلاں مقالہ مصنفہ کا تحریر کردہ ہے اور دیگر مضامین مصنف نے تحریر کیے ہیں۔ اس سے زیادہ بہتر طور پر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مصنفہ کا اس تصنیف میں کس قدر حصہ ہے۔

زمرد محمود اور محمود الحسن کا اشاریہ بعنوان ''اقبالیات کا موضوعاتی تجزئی اشاریہ'' علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد سے

۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ مرتبین کی یہ کاوش نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی و بین الاقوامی محققین اور شارحین اقبال کے لیے معاون و مددگار ہوتی ہے اور ناقدین اقبال تقابلی مطالعہ اور مطالعاتی جائزہ لیتے وقت اپنی آراء و نقد و نظر کو مزید وزنی بنا سکتے ہیں۔ نیز مستند حوالے کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ اشاریہ کی ترتیب انفبائی ہے اور سر انداراج موضوعاتی عنوان ہے۔ ہر اندراج کے تحت قوسین میں کتاب کا نام، اس کے مصنف یا مرتب، سال اشاعت اور صفحات کے شمار دیے گئے ہیں تاکہ مضمون کی وسعت، گہرائی اور حوالے کی صحت قائم رہے۔ کل اندراجات کا شمار قریباً ۳۷۱۹ ہے جنھیں اردو، فارسی اور عربی کتب وغیرہ سے لے کر شامل کیا گیا ہے۔ حروف وار اندراجات اس لیے درج کیے گئے ہیں کہ اگر جامع ایڈیشن کو بعد ازاں اجزا کی صورت میں پیش کرنا پڑے تو ان کی ضخامت اور جزوی تقسیم کا اندازہ لگایا جا سکے۔

ڈاکٹر شمیم ملک گورنمنٹ اسلامیہ کالج برائے خواتین کوپر روڈ، لاہور میں صدر شعبہ اردو کے عہدے پر فائز تھیں۔ انھوں نے کالج کے مجلّہ ''محمل'' میں شائع ہونے والے اقبال پر خواتین کے مضامین کو بے حد کاوش سے اکٹھا کیا۔ ان مضامین کی فہرست خاصی طویل تھی لہٰذا حجم میں اضافے کے پیش نظر انتخاب کر کے کوشش کی گئی ہے کہ اچھے و معیاری مضامین کو سامنے لایا گیا ہے۔ ان مضامین کو کتابی صورت میں بزمِ اقبال، لاہور سے دسمبر ۱۹۸۸ء میں شائع کیا گیا۔ اس کے ناشر ڈاکٹر وحید قریشی معتمد اعزازی بزم اقبال کلب روڈ، لاہور ہیں۔ کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اردو مضامین ۱۰۶ اور انگریزی مضامین ۴۸ صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس کتاب میں کل ۲۴ مضامین شامل ہیں۔ ان میں سے ڈاکٹر سید عبداللہ کے مضمون کے علاوہ خواتین کے تحریر کردہ اردو مضامین اور ۷ انگریزی مضامین شامل ہیں۔

فیض احمد فیض کے اقبال پر لکھے گئے مضامین کو شیما مجید نے مرتب کیا اور یہ کتاب کی صورت میں مکتبہ عالیہ، لاہور سے پہلی بار ۱۹۸۷ء اور دوسری بار ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب فیض کے ۷ مضامین، کتاب ''روزگار فقیر'' پر لکھے گئے مقدمے، اقتباسات، دو نظموں اور دو انگریزی مضامین پر مشتمل ہے۔ فیض کے انگریزی دو مضامین کا اردو ترجمہ اردو مضامین میں دے دیا گیا ہے۔ ایک مضمون کا ترجمہ پروفیسر سجاد باقر رضوی نے کیا ہے جو ''نقوش'' لاہور میں شائع ہوا تھا جب کہ دوسرے مضمون کا ترجمہ شاہد علی نے کیا ہے۔ یہ کتاب اس ضمن میں افادیت کی حامل ہے کہ فیض کے اقبال کی شاعری اور فن پر لکھے گئے اردو انگریزی مضامین اور دو نظمیں اقبال پر شامل کی گئی ہیں ان میں سے ایک نظم ایسی ہے جو فیض کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بظاہر اقبال اور فیض کے نظریات میں بڑا تفاوت ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ فیض اقبال کی انقلابی قدر سے بڑے مسحور تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ آخر تک اقبال کی عظمتِ فکر کے قائل رہے۔

جرمن خاتون ڈورس احمد جو اقبال کے بچوں کی گورنس اور گھر کی منتظمہ تھیں کی کتاب "Iqbal as I knew him" (۱۹۸۶ء) بھی بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ زیب النساء کی اقبال کی نثر سے متعلق تین تصانیف بے حد نمایاں ہیں۔ ''اقبال اور بچوں کا ادب'' (۱۹۹۲ء)، اقبال کی متفرق غیر مطبوعہ تحریروں، تقاریظ اور مختلف کتب پر لکھے گئے دیباچوں کو ''نگارشاتِ اقبال''

(۱۹۹۳ء) میں مرتب کرکے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ''اقبال کی اردو نثر ایک مطالعہ'' (۱۹۹۷ء) بھی اہم ہے۔ ''نگارشاتِ اقبال'' میں اقبال کے دیباچوں، تقاریظ اور آرا کا تنقیدی جائزہ اور ان کی اہمیت اُجاگر کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ جن تحریروں کے سنین کا تعین نہیں ہوسکا، ان کا شمار سنہ ندارد کے تحت کیا گیا ہے۔ اتنی زیادہ تعداد میں اس سے قبل اقبال کی متفرق تحریریں کبھی جمع و مرتب نہیں کی گئیں۔ علامہ کے افکار خصوصاً ان کی نثر پر کام کرنے والے محققین اور نقادوں کو اس مجموعے کی بدولت اقبال کے متفرق نثر پاروں سے رجوع و استفادہ آسان ہوگا۔ زیب النساء بیگم کی یہ کاوش لائق ستائش ہے۔ انھوں نے بے حد محنت سے اقبال کی متفرق تحریروں پر مفصل تنقیدی تبصرہ قلم بند کیا ہے، جو بہت مفید ہے۔ علامہ کی نثر میں ان تقاریظ کی معنویت و افادیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی اور اقبال کی مستند سوانح عمری مرتب کرتے ہوئے ان سے بھی بخوبی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ ''اقبال کی اردو نثر ایک مطالعہ'' میں مصنفہ نے اقبال کی نثری تصانیف کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ ان نثری تصانیف میں ''علم الاقتصاد''، ''تاریخ، تصوف''، اردو مضامین اور خطوط شامل ہیں۔ مصنفہ نے اقبال کے نثری اسلوب پر بحث کرتے ہوئے مختلف حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ علامہ صرف ایک عظیم شاعر ہی نہیں ایک صاحبِ طرز نثر نگار بھی ہیں۔ اگرچہ اقبال نے کسی خاص ضابطے اور قلبی لگاؤ سے نثر نہیں لکھی مگر ان کا جتنا بھی نثری سرمایہ ہے وہ مواد اور طرز بیان دونوں اعتبار سے اس قابل ہے کہ اسے اردو کی نثری تاریخ میں نمایاں مقام دیا جائے۔

منزہ ماجد کی اقبال کی طویل نظموں پر تسہیل و تنقید پر مشتمل کتاب ''تسہیل اقبال'' صوفی تبسم اکیڈمی، راولپنڈی سے اپریل ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی۔ مصنفہ نے اقبال کی دس طویل اور مشہور نظموں کو بچوں کی آسانی اور سہولت کی خاطر سادہ اور سلیس زبان میں مختصر انداز میں ڈھال کر پیش کیا ہے تاکہ وہ ان نظموں میں موجود اقبال کے دقیق اور گہرے فلسفیانہ تصورات و نظریات کی تفہیم با آسانی کرسکیں اور ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں۔ گویا یہ کام اس قدر اعلیٰ پائے کا نہیں کہ اسے نامور مرد اقبال شناسوں کے کام کے ساتھ رکھا جاسکے تاہم مصنفہ کی یہ کاوش اس ضمن میں اہم ہے کہ بچوں اور طالب علموں کے نقطۂ نظر کے مطابق ہے اور اقبال کے دقیق فلسفیانہ تصورات کی تفہیم با آسانی ہو جاتی ہے۔

''اشاریہ سہ ماہی مجلّہ اقبال'' مرتبہ اختر النسا (۱۹۹۴ء)، ''اشاریہ کلام اقبال فارسی'' مرتبہ زبیدہ بیگم (مئی ۱۹۹۶ء) اور ''اشاریہ اقبالیات'' مرتبہ اختر النساء (۱۹۹۸ء) یہ کاوشیں بھی اقبال شناسی کے میدان میں خواتین کے کردار کو مزید مستحکم بناتی ہیں۔

مشہور دانشور، ماہر تعلیم اور ادیب ڈاکٹر سید عبداللہ کی صاحبزادی عطیہ سید کی کتاب ''اقبال... مسلم فکر کا ارتقاء'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی۔ تاریخی نوعیت کی اس تصنیف میں یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال مختلف مسلم فلسفیانہ تحریکوں اور مفکرین کو کس نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ اس تصنیف میں موجودہ تاریخ ان بیانات کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے جو اقبال کی دونوں نثری تصانیف یعنی ''ایران میں مابعد الطبعیات کا ارتقا'' اور ''اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل نو'' میں ملتے ہیں یہ کتاب بڑی محنت اور خوبصورتی سے رواں اردو فلسفیانہ نثر میں لکھی گئی ہے جس میں فلسفے کی اصطلاحوں کا استعمال ہونے کے

باوجود ایک عام قاری کے لیے مشکل فلسفیانہ مضامین کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوتی۔ اس کتاب میں اقبال کے علاوہ دیگر بہت سے مسلم حکماء کا ذکر اور اقبال سے ان کا تقابل بھی موجود ہے۔ یوں یہ تصنیف مطالعۂ اقبال اور باقی مسلم حکماء کی تفہیم نظریات میں وسعت پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوئی ہے۔ بیگم رشیدہ آفتاب اقبال (اقبال کے فرزندِ اکبر آفتاب اقبال کی بیوہ) کی کتاب ''اقبال اور ان کے فرزندِ اکبر آفتاب اقبال'' (۱۹۹۹ء) اقبال اور ان کے فرزندِ اکبر سے متعلق غلط فہمیوں کے تدارک کے ضمن میں اہمیت کی حامل ہے۔ مصنفہ نے باپ بیٹے کے مابین رنجشوں کی نشاندہی کرتے ہوئے تمام حالات کا جائزہ لیا اور یہ بتایا ہے کہ اس قسم کی رنجشوں کا پایا جانا ہماری معاشرتی زندگی کے معمولات میں سے ہے اور اس سے غیر حقیقی نتائج اخذ کر لینا قطعی مناسب امر نہیں۔ اقبال کی بڑی بہو بیگم رشیدہ آفتاب اقبال نے اقبال کے خاندان کے سلسلے میں جو نئی معلومات پیش کی ہیں وہ اس خاندان میں ایک عمر گزارنے کا حاصل ہیں۔ انھوں نے حافظے میں موجود معلومات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے قیمتی معلومات کو ضائع ہونے سے بچا لیا۔ کتاب میں شامل کچھ تحریریں اور تصاویر پہلی مرتبہ اسی کتاب میں شائع ہوئی ہیں۔ ان نوادرات کی شمولیت سے اس کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔

اقبالیات پر علمی اور فکری سطح پر کام کرنے والی خواتین میں پروفیسر شاہدہ یوسف کا اضافہ اقبال کی شاعری، فلسفے اور مختلف سیاسی تصورات کے حوالے سے نہایت قابل تعریف ہے۔ مصنفہ کے ''اقبالیات''، ''اقبال''، ''قومی زبان'' اور ''صحیفہ'' جیسے وقیع علمی و ادبی رسائل میں شائع شدہ ۱۱ مقالات کا مجموعہ ''اقبال کا شعری و فکری مطالعہ'' نظریہ پاکستان اکادمی، لاہور سے ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ کسی پیشہ ور نقاد کی تحریروں کے بجائے اقبال کے ایک ذہین قاری کی ادبی تخلیق ہے۔ یہ کتاب اقبال کے فکر و فن پر شائع ہونے والی دوسری بے شمار کتب سے مثبت طور پر مختلف ہے۔ مصنفہ نے جس حیرت انگیز سلیقے سے اقبال کے شعری اور فکری منظرنامے کے خدوخال اُجاگر کیے ہیں، اسے دیکھتے ہوئے اس اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے کہ ہماری نئی نسلیں اقبال کو پڑھنے اور اسے صحیح معنوں میں سمجھنے کی بے حساب صلاحیتیں رکھتی ہیں جس کا ثبوت مصنفہ کی یہ تصنیف ہے۔ یقیناً مصنفہ کا نام اقبال شناس خواتین میں ممتاز رہے گا بلکہ بے شمار مرد مصنفین کے لیے بھی ان کے یہ مضامین دلچسپی اور کشش کا باعث بنے رہیں گے کیوں کہ پروفیسر شاہدہ یوسف اظہار پر پوری قدرت رکھتی ہیں۔

تیسرے دور ۲۰۰۱ء سے ۲۰۰۵ء تک خواتین اقبال شناسوں کا جو کام منظرِ عام پر آیا اس میں یاسمین رفیق کا ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ نظرِ ثانی اور تصحیح و ترمیم کے بعد کتابی صورت میں بعنوان ''اشاریہ کلامِ اقبال (اردو)'' بھی شامل ہے جو کہ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور سے ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ یہ کاوش اس اعتبار سے قابلِ تحسین ہے کہ اس نوعیت کے کام اقبال شناسوں کی توجہ سے محروم ہیں کیوں کہ حوالہ جاتی تحقیقی کام مشکل اور جان لیوا ہوتے ہیں اور ان میں تنقیدی مضامین لکھنے سے کہیں زیادہ محنت درکار ہوتی ہے۔ خصوصی طور پر بچوں اور طلبا کے لیے آمنہ صدیقہ کی لکھی گئی سوانح عمری ''داستان اقبال'' لاہور سے نومبر ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی۔

بصیرہ عنبرین کی تصنیف ''تضمیناتِ اقبال'' فکشن ہاؤس، لاہور سے ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی۔ مصنفہ نے اس تصنیف کو صرف اقبال کے اردو کلام تک محدود نہ رکھا بلکہ ان کے سارے فارسی کلام کو بھی پیش نظر رکھ کر ایک جامع جائزہ مرتب کیا ہے۔ فن تضمین کی تعریفوں اور ان کی تنقیحات سے لے کر اس کی اقسام اور اس کی ضرورت و اہمیت پر عمدگی سے بحث کی ہے اور بھرپور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اقبال تضمینات کے باب میں بھی مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں۔ مصنفہ کا اسلوب تشریحی و توضیحی ہے اور انھوں نے تفہیمِ شعر کی کئی سطحوں کو اجاگر کیا ہے۔ اس کے ساتھ اقبال کے تضمین کردہ اشعار کو من و عن قبول کرنے کے بجائے انھیں اصل متون میں تلاش کر کے ان کا تقابل کیا ہے۔ یہ علمی اور تحقیقی کاوش محض اعداد و شمار کا مجموعہ نہیں بلکہ تجزیاتی اور فکری سطح پر بھی مصنفہ کی بالغ نظری کی غماز ہے۔ بلاشبہ مصنفہ کی یہ کاوش اقبال شناسی کے میدان میں ایک نیا اور تازہ اضافہ ہے۔ انھوں نے اقبال شناسی کے حوالے سے ایک بالکل مختلف اور غیر معروف موضوع پر نہایت عمدگی کے ساتھ کام کیا۔ اس موضوع پر مصنفہ سے قبل سوائے چند مضامین کے باقاعدہ کوئی تحقیقی و تنقیدی نوعیت کا کام نہیں ہوا تھا اس حوالے سے بھی مصنفہ کی یہ کاوش قابل تحسین ٹھہرتی ہے۔

زبیدہ بیگم کا مرتب کردہ ''اشاریہ کلامِ اقبال'' الفیصل ناشران و تاجران کتب اردو بازار، لاہور سے ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر روبینہ ترین اور ڈاکٹر انوار احمد کی مرتبہ کتاب ''خطبات اقبالیات'' شعبہ اردو بہاؤ الدین زکریا یونی ورسٹی ملتان کے زیر اہتمام جولائی ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی۔ ۲۰۷ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مختلف اہل قلم کے ۱۸ مضامین شامل ہیں۔ مرتبین کی یہ کاوش معاشرے میں فکر کی رو کو متحرک کرنے اور ایک نئے سلسلہ خیال کو فروزاں کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر شگفتہ زکریا کی مرتبہ ۱۸۴ صفحات پر مشتمل کتاب ''فکر و فن'' (جنوری ۲۰۰۴ء) اہم ناقدین کی اقبال کی شخصیت، فکر اور فن پر دائمی اہمیت کی حامل تحریروں کا ایک اہم مجموعہ ہے۔

اس دور کی سب سے نمایاں اور اہم ترین تصنیف ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف کی ''اقبال اور عصری مسائل'' ہے جو سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ ایک کوشش ہے کہ اقبال کو اس کے افکار کے حوالے سے نہ صرف پڑھا جائے بلکہ یہ دیکھا جائے کہ موجودہ دور میں ان کے فکری رجحانات کہاں تک ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف نے اقبال کے افکار کی روشنی میں تمام امتِ مسلمہ بالخصوص پاکستانی مسلمانوں کو درپیش ملکی و بین الاقوامی مسائل کا جائزہ لینے کے بعد ان کے افکار کو سمجھنے اور ان کی روشنی میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اقبال کے افکار کی روشنی میں پاکستان کو موجودہ دور میں درپیش مسائل کے تجزیے کے حوالے سے مصنفہ کی یہ تصنیف اقبالیات میں بے حد اہم اضافہ ہے۔

اقبال شناسی کے میدان میں عموماً خواتین کے کیے گئے کام کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ انفرادی طور پر چند خواتین جیسے ڈاکٹر این میری شمل، لوس کلوڈ، بیگم عطیہ فیضی، ڈاکٹر جمیلہ خاتون کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا مگر مجموعی طور پر خواتین کے کام کو سنجیدگی

سے نہیں لیا جاتا۔ صنف نازک ہونے کی بنا پر ان سے شاعری یا افسانہ نگاری کی توقع رکھی جاتی ہے لیکن تحقیق وتنقید اور اقبالیات کے ضمن میں ان کے کام کو مرد تحقیق کاروں، ناقدوں اور اقبال شناسوں کی طرح اہمیت نہیں دی جاتی۔ حالاں کہ اقبال شناسی کے وسیع اور بیکراں سمندر میں جہاں مرد حضرات کو شناوری کا فخر حاصل ہے وہیں خواتین بھی اس میدان میں کسی طرح ان سے کم نہیں۔ اقبال شناسی میں خواتین کے کردار کا جائزہ لیتے ہوئے ۳۴ اقبال شناس خواتین کی تقریباً چالیس تصانیف کو سامنے لایا گیا ہے جن میں کتب، مرتبات اور اشاریے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر خواتین جیسے ڈاکٹر شمل (جرمن)، لوس کلوڈ میتر (فرانسیسی)، روسی خواتین ایل گورڈن پولنسکایا، نتالیا پری گارینا، پیرس کی ڈاکٹر ایوا میوروِوچ، امریکہ کی ڈاکٹر باربرا مٹکاف اور کینیڈا کی ڈاکٹر شیلا میکڈونف کے نام نمایاں ہیں۔

ان اقبال شناس خواتین کی تصانیف کے علاوہ جامعات میں خواتین کا کیا گیا تحقیقی کام بے شمار مقالہ جات کی صورت میں موجود ہے جو کتابی صورت میں شائع نہ ہو سکنے کے باعث ابھی تک منظر عام پر نہیں آ سکا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے یہاں تو تعلیمی ادارے تحقیقی و علمی مقالہ جات کی اشاعت میں مالی مدد کرتے ہیں نہ ہی پبلشرز اس میں کوئی دلچسپی رکھتے ہیں۔ لہٰذا خواتین کا اقبال شناسی کے ضمن میں جو بھی کام ہمارے سامنے موجود ہے، ان کی شخصی و ذاتی تگ و دو کا نتیجہ ہے۔ چوں کہ ہمارے معاشرے میں خواتین یہ تگ و دو بوجوہ زیادہ نہیں کر سکتیں لہٰذا اقبالیات پر مبنی ان کا بیشتر کام مقالات کی صورت میں مختلف جامعات کی لائبریریوں تک محدود ہے۔

اس مقالہ کا یہ ہرگز مقصد نہیں کہ خواتین اقبال شناسوں کا مرد حضرات کے کیے گئے کام کے ساتھ مقابلہ وموازنہ کیا جائے یا خواتین کے کیے گئے ہر نوعیت اور ہر درجے کے کام کو خامیوں کے باوجود محض سراہا ہی جائے۔ اس کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ جس طرح باقی شعبہ ہائے زندگی اور اردو زبان وادب میں خواتین مردوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہیں، اسی طرح اقبال شناسی کے میدان میں بھی انھوں نے اب تک جو بھی تحقیقی، تنقیدی یا علمی وفنی کام کیا ہے وہ مردوں کے تحقیقی وتنقیدی کام سے کسی طور بھی کمتر درجے کا نہیں ہے بلکہ یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ بعض خواتین کے ہاتھوں سے ایسے اہم تحقیقی وتنقیدی کام سامنے آئے ہیں جن کی مثالیں اقبالیات میں بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔

خواجہ رضی حیدر

تابش دہلوی — تہذیبی تشخص کے شاعر

برسی کے موقع پر

مسعود الحسن تابش دہلوی کے نام اور آواز سے تو میری سماعت لڑکپن سے ہی آشنا و مانوس تھی کیوں کہ وہ ریڈیو پاکستان سے خبریں پڑھا کرتے تھے لیکن اُن سے مجھے نیاز ۱۹۶۴ء میں حاصل ہوا اُس وقت میں انٹر میڈیٹ کا طالبِ علم تھا اور یاور مہدی کے مشہورِ زمانہ پروگرام ''بزمِ طلبہ'' میں شرکت کے لیے ریڈیو پاکستان کراچی اسٹیشن گیا تھا۔ مجھے اس پروگرام میں ایک مضمون ''ہماری زندگی میں تاریخ کا مقام'' پڑھنا تھا۔ یاور مہدی نے جن کو تمام طالبِ علم ''یاور بھائی'' کہتے تھے مجھ سے کہا کہ برابر کے کمرے میں تابش دہلوی صاحب بیٹھے ہیں آپ اُن کو اپنا مضمون سنا دیں تا کہ وہ آپ کا تلفظ دیکھ لیں۔ میں برابر کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں شگفتہ رُخ تابش دہلوی صاحب تشریف فرما تھے۔ مجھے دیکھتے ہی گویا ہوئے۔ آیئے میاں۔ بیٹھیے۔ کیا مضمون ہے پڑھیے۔'' میں نے لرزتی ہوئی آواز میں مضمون سنانا شروع کر دیا۔ کئی مقامات پر انھوں نے آواز کے اُتار چڑھاؤ اور تلفظ کے بارے میں مشورہ دیا۔ خصوصاً مشہور تاریخ دان ابن خلدون کے نام کا تلفظ درست کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اس نام کا بہت پڑھے لکھے لوگ بھی تلفظ غلط کرتے ہیں۔ یہ ''خَلدُون'' ہے ''خَلدُون'' نہیں ہے۔ ''خ'' کا ''ل'' سے وصل ہے۔ ''خ'' پر زبر نہیں۔ ''خ'' اور ''ل'' جزم ہے۔ ''خ'' اور ''ل'' کو الگ الگ ادا کریں گے تو اس کا تلفظ غلط ہو جائے گا۔ عربی ناموں میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔'' تابش دہلوی جس زمانہ میں مسعود تابش کے نام سے ریڈیو پاکستان سے خبریں پڑھتے تھے اُس وقت درحقیقت عوام الناس کے لیے خبروں کا یہ مختصر دورانیہ صحتِ لفظی یعنی تلفظ کی دُرستی کا ایک تدریسی دورانیہ تصور کیا جاتا تھا۔

تابش دہلوی صاحب سے اوّلین تعارف کے بعد مجھے پھر ریڈیو اسٹیشن پر اکثر اُن سے نیاز حاصل ہوتا رہا، شعری نشستوں میں بھی اُن کو سُننے کا شرف حاصل ہوا۔ خصوصاً ۱۹۶۶ء میں بزمِ طلبہ کے زیرِ اہتمام جب میں نے ایک مشاعرہ جناح کالج میں منعقد کیا تو اس مشاعرہ میں مدعو کرنے کے لیے میں تابش دہلوی کے دولت کدے پر حاضر ہوا۔ وہ نہایت شفقت سے پیش آئے اور تاکیداً فرمایا شاعری صرف سنا ہی مت کیا کرو پڑھا بھی کرو۔ پڑھنے سے شعر کی معنوی تہوں تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ مشاعرے تو ''واہ واہ''

ہوتے ہیں۔یہی وہ موقع تھا جہاں سے تابش دہلوی سے میری باقاعدہ نیاز مندی کا آغاز ہوا۔اُس وقت میں شعر نہیں کہتا تھا لیکن مجھے جدید شعرا کے بہت اشعار یاد تھے۔میرے ذوق وشوق کو دیکھ کر وہ اکثر مجھے اساتذہ کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیتے۔اُن کا خیال تھا کہ اساتذہ کے ہاں قدامت ضرور ہے لیکن فنی ومعنوی حسن والتزام بھی وہاں ہے جو ہر دور میں اچھی شاعری کے لیے ضروری ہے۔شعر کی تفہیم کا سلیقہ اساتذہ کا مطالعہ کیے بغیر نہیں آتا۔''

تابش دہلوی صاحب ناظم آباد تین نمبر میں مقیم تھے اور میں ناظم آباد نمبر دو میں رہتا تھا۔اسی زمانہ میں نوح ناروی کے جانشین حضرت دعا ڈبائیوی نے بھارت سے نقل مکانی کر کے میرے پڑوس میں رہائش اختیار کی۔دعا ڈبائیوی کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا لہٰذا اُن کے گھر ملاقات کے لیے عموماً شاعر آیا کرتے تھے۔کبھی کبھی تابش دہلوی صاحب بھی تشریف لاتے جس کی بنا پر مجھے تابش صاحب سے مزید قربت حاصل ہوگئی۔رضویہ سوسائٹی کی امام بارگاہ میں تابش دہلوی نے ڈاکٹر یاور عباس کی جانب سے منعقدہ ایک خصوصی مجلس میں پہلی مرتبہ مرثیہ پڑھا جسے سُننے کے لیے میں بھی اپنے ہم عمر احباب کے ساتھ وہاں گیا تھا۔مجھے یاد ہے کہ تابش دہلوی کے مرثیہ میں تشیع غالب نہیں تھا پھر بھی اُن کو بہت داد دی گئی۔مجلس کے اختتام پر معروف نقاد پروفیسر مجتبیٰ حسین نے تابش صاحب سے مرثیہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''ایک سنّی کو اسی طرح مرثیہ لکھنا چاہیے۔آپ نے داد خواہی کے لیے نہیں سچے جذبۂ عقیدت کے ساتھ مرثیہ لکھا ہے۔'' تابش صاحب اپنے عقیدے میں واضح آدمی تھے اور کبھی اپنی زبان سے کوئی ایسا حرف ادا نہیں کرتے تھے جو کسی کی دلآزادی کا باعث ہوسکے۔ہر مسلک اور عقیدے کا آدمی اُن سے بغیر کسی احتیاط اور پیش بندی کے قریب ہو جاتا تھا۔شاید تابش صاحب کا یہی مزاج اُن کی ہر دلعزیزی کا ایک بڑا سبب تھا۔

تابش صاحب اپنی تہذیب وشائستگی، کشادہ خیالی اور تخلیقی اہتمام والتزام میں مثالی آدمی تھے۔انھوں نے اپنی زندگی کے اسّی سال شعر وادب کے حوالے سے بسر کیے اور اس مال ومنال اور قحط الرجال سے آلودہ ادبی ماحول میں اپنے مزاج سے فضیلتوں کے چراغ روشن کرتے رہے۔وہ ایک عمر ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہنے کے باوجود نہ کسی اہم عہدے پر فائز رہے اور نہ وہ مالی فراوانی کبھی اُن کو میسّر آئی جو ہمارے ہاں اکثر تخلیق کاروں کو ممتاز اور قابلِ ذکر بناتی ہے۔تابش صاحب کا امتیاز اُن کا فن اور شخصی رکھ رکھاؤ تھا اور انہی اوصاف نے اُن کو اس قدر قابلِ احترام بنا دیا تھا کہ کوئی بھی محفل ہو اُن کی ذات نمایاں اور مرکزِ نگاہ رہتی تھی۔معروف دانشور سید ہاشم رضا نے ایک محفل میں تابش دہلوی کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''کسی فنکار کو یہ احترام کسی مادّی یا سیاسی بالادستی سے نہیں ملتا بلکہ اُس عرفانِ علم سے ملتا ہے جو شعوری اور لاشعوری دونوں سطح پر فہم وادراک کو بلوغت سے ہمکنار کرتا ہے۔تابش صاحب اُن گرانقدر مثالوں میں سے ایک ہیں جو اپنے ادبی رکھ رکھاؤ کے سبب شکست وریخت اور انتشار وافتراق میں مبتلا شہر کراچی کی ادبی فضا میں ایک دبستان کا درجہ رکھتے ہیں۔''

تابش صاحب کی شاعری دہلی کے اُس اسکول سے تعلق رکھتی ہے جو مرزا غالب سے معنون ہے۔وہ فانی بدایونی کے شاگرد تھے اور فانی بدایونی کا غالب کے مکتبۂ فکر سے اس قدر ربط تھا کہ اگر فانی بدایونی اپنی شاعری میں میر تقی میر کی یاسیت کا پیوند لگاتے تو وہ مرزا

غالب کے طرزِ اظہار میں محصور ہو کر رہ جاتے۔ تابش دہلوی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے فانی کی یاسیت اور غالب کی بلند آہنگی کو اس قدر ملائم کیا کہ اُن کا اپنا لہجہ ظہور میں آ گیا ہے۔ نوجوان شاعر عرفان ستار کا خیال ہے کہ ''اپنے اندازِ فکر اور لہجے کے تعین کے لیے تابش دہلوی نہ صرف ایک طویل تجزیہ اور غور و فکر سے گزرے ہوں گے بلکہ انھوں نے اُس رمز تک رسائی بھی حاصل کی ہو گی جس نے غالب اور فانی کو فانی کے مرتبہ پر فائز کیا اور اسی بنا پر تابش دہلوی کی شاعری روایت اور جدیدیت کے مابین صرف ایک توازن کی نمائندہ ہے بلکہ شاعری کے اُس تاریخی تسلسل کا حصہ ہے جس کا آغاز میر سے ہوا اور فانی پر آ کر ٹھہر گیا۔ انھوں نے اردو شاعری کی تہذیبی اقدار کو اپنے فن میں اس طرح سمویا ہے کہ جہاں ایک طرف روایت کی موثر نمائندگی ہو گئی ہے وہاں حال کی جدّت کے مثبت خطوط بھی اجاگر ہو گئے ہیں۔''

تابش دہلوی کے ہاں غزل اپنے موضوعات کے تنوع اور پورے تہذیبی بانکپن کے ساتھ موجود ہے۔ فنی ریاضت اور تخلیقی قوت کے اشتراکِ عمل سے اُن کی شاعری ظہور کرتی ہے۔ جیسا کہ معروف دانشور احمد جاوید نے ایک گفتگو میں کہا تھا کہ ''خیالات کی فراوانی اور الفاظ و معنی کی یکجائی کا تابش دہلوی کے فکر و فن کی معیار میں اہم کردار ہے۔''

فیصلہ اب یہ مکینوں ہی کو کرنا ہو گا
گھر کو گھر رکھنا ہے یا گھر کو مکاں کرنا ہے

ہم نے تو عیب سدا اپنے ہُنر کو سمجھا
لوگ تو بے ہُنری کو بھی ہُنر جانتے ہیں

چھوٹی پڑتی ہے اَنا کی چادر
پاؤں ڈھکتا ہوں تو سر کھلتا ہے

مجھ سے کچھ خوش مرا ہمسایہ نہیں تھا لیکن
سایہ ہمسائے کی دیوار نے گھر پر رکھا

تو ہی رہتا ہے دیر تک موجود
بزم میں تو جہاں سے اُٹھتا ہے

اک قدم ہم کو اُٹھانا دشوار
اور یہی فاصلہ منزل ٹھہرا

اس قدر کوئے شب و روز سے ناواقف ہوں
بارِ ہستی نہیں معلوم کہاں رکھنا ہے

تو مل گیا ہے مگر شوق کے مراحل میں
تری تلاش تری جستجو تو اب بھی ہے

ہم نے اس دنیا کو اے اہلِ جہاں
اس قدر چاہا کہ نفرت ہو گئی

پھر سینۂ آرزو میں ایک زخم
سورج کی طرح نکل رہا ہے

کس کس کو میرا مدِ مقابل کہا گیا مجھ کو سُنا کے میری ہی آوازِ باز گشت

ختم اک عہد آرزو تو ہوا دل کا ٹوٹنا ہے سانحہ لیکن

حیراں ہوں ترے طالبِ دیدار کہاں تک آئینہ در آئینہ ترا حُسن

تابش دہلوی کے معاصرین نے اُن کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے تابش صاحب کو ایک ایسا شاعر قرار دیا ہے جس نے موجودہ عہد میں زبان و بیان کی لطافت اور حلاوت کو صحت کے ساتھ یکجا کر کے غزل کی تخلیقی قوت کو اعتبار سے روشناس کرایا ہے۔ احسان دانش نے لکھا ہے کہ ''تابش دہلوی کی شاعری تہذیب یافتہ ادب کی بہترین مثال ہے۔'' ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں کہ ''تابش دہلوی کی شاعری میں معنی آفرینی اور دل نشینی کی ایک ایسی سنجیدہ فضا موجزن ہے جس سے اُن کے بہت سے معاصر محروم ہیں۔'' احمد ندیم قاسمی کا کہنا ہے کہ ''تابش دہلوی نے اپنی غزل میں درد کی تہذیب اور غم کی شائستگی کے ساتھ ہی ساتھ حیات اور ماورائے حیات کے مسائل سے فن کی سطح پر نمٹنے کی خوبصورت اور موثر مثالیں پیش کیں ہیں۔' سلیم احمد نے لکھا ہے کہ ''تابش دہلوی کے ہاں زبان و بیان کے حوالے سے شاعری میں ایک ایسا ارتکاز اور صحت پائی جاتی ہے جو فی زمانہ کمیاب ہے۔'' پروفیسر مجتبیٰ حسین کا خیال ہے کہ ''تابش دہلوی کی آواز اس دورِ شور آفریں میں ثقہ، سنجیدہ اور فکر انگیز ہے۔'' تابش دہلوی خود اپنی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''میں خود جدید و قدیم کے سنگم پر کھڑا ہوا ہوں۔ اس لے میری غزلوں میں آپ کو دونوں دھارے بہتے نظر آئیں گے۔ میرے نزدیک جدت کا نام مہمل گوئی نہیں ہے بلکہ اسلوب کے نئے پن کو میں جدت سمجھتا ہوں۔ کوئی خیال نیا نہیں ہے۔ خیال کو صرف اسلوب و اظہار نیا پن دیتا ہے اور غزل کی شاعری میں نیا پن مشکل سے پیدا اور حاصل ہوتا ہے۔'' تابش صاحب کو اظہار کے روایتی اسالیب کے استعمال پر جہاں قدرت حاصل ہے وہاں وہ اپنی فطری جدت و ندرت سے انفرادیت اور تازہ گوئی کو عام کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ جذبہ اور فکر کو ہم آہنگ کرنے پر اُن کی مکمل توجہ رہتی ہے۔

شعر و ادب سے تابش دہلوی کا رشتہ اکتسابی نہیں موروثی تھا۔ وہ اپنے والد کی طرف سے معروف فارسی شاعر مولوی نظام الدین نظامی اور والدہ کی طرف سے شمس العلماء منشی ذکا اللہ دہلوی کے خانوادوں سے تعلق رکھتے تھے جب کہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ آپ کی اہلیہ کے رشتے دار اور مرزا غالب کے رشتہ میں خالو تھے۔ تابش دہلوی ۱۹۱۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۹ء تک اپنے ددھیال لکھنؤ میں رہے۔ ۱۹۲۳ء میں جب وہ آٹھویں جماعت میں تھے شعر کہنا شروع کیا۔ ۱۹۳۰ میں حیدر آباد دکن سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اسی سال اردو کے سب سے معیاری رسالہ ''ماہنامہ ساقی'' دہلی میں اُن کی پہلی نظم شائع ہوئی۔ گویا ۱۹ سال کی عمر میں انھوں نے سندِ اعتبار پالی۔ ابتداً فانی بدایونی سے اصلاح لی لیکن رنگِ فانی اختیار نہیں کیا۔ پہلا شعری مجموعہ ''نیم روز'' ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا تھا اور اس مجموعہ کی تقریب تعارف اب سے بیالیس سال قبل آرٹس کونسل، کراچی میں ہوئی تھی۔ اس تقریب کے صدر معروف ماہر تعلیم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور مہمانِ خصوصی جوش ملیح آبادی تھے۔ کراچی میں کسی شعری مجموعہ کی یہ پہلی تقریبِ تعارف تھی۔ گویا کتابوں کی

تقریبِ تعارف کے انعقاد و آغاز کی جدّت کا اعزاز بھی تابش دہلوی کو حاصل ہے۔

تابش دہلوی کے اُن کی زندگی میں چھ شعری مجموعے شائع ہوئے، نیمروز ۱۹۶۳، چراغِ صحرا ۱۹۸۳، غبارِ انجم ۱۹۸۴، تقدیس، ۱۹۸۴، ماہِ شکستہ، ۱۹۹۳ اور دھوپ چھاؤں، ۱۹۹۶ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی یادوں کے حوالے سے ایک کتاب ''دید باز دید'' بھی مرتب کی جو گزشتہ اسّی سال کی ادبی سماجیات کا ایک ایسا مرقع ہے جس میں شعرا ادبا اور فنونِ لطیفہ سے وابستہ افراد کے مثبت اور منفی رویّوں کی خفی اور جلی داستانیں پھیلی ہوئی ہیں۔

تابش صاحب مشاعروں کو سماجی تہذیب کی تشکیل کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ انھوں نے مشاعروں کی اہمیت اور روایت پر نہ صرف مضامین تحریر کیے ہیں بلکہ اپنی زندگی میں تخمیناً پانچ ہزار سے زائد مشاعروں میں شرکت کی۔ ایک اور بات یہ ہے کہ تابش دہلوی کی شاعرانہ اور مشاعرانہ مصروفیتوں سے ہٹ کر ایک مصروفیت اور بھی تھی اور وہ مصروفیت اپنے اہلِ خانہ اور اپنی گھریلو ذمہ داریوں کے حوالے سے تھی۔ وہ ایک نہایت فعال سربراہِ خانہ تھے۔ اکثر شعرا گھریلو ذمہ داریوں سے بحسن و خوبی تو کیا واجبی طور پر بھی عہدہ برآ نہیں ہو پاتے لیکن تابش صاحب نے اس حوالے سے خود کو ایک مثالی شوہر اور مثالی باپ کے روپ میں پیش کیا اور آخری وقت تک اپنے گھر کے تمام کام بہ اصرار خود انجام دیتے رہے۔

تابش دہلوی کے شعری مجموعوں کی روشنی میں اُن کی شاعری پر اب تک متعدد مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ ان میں بیشتر مضامین کو اُن کے عزیز شاگرد محترم نعیم میرٹھی نے ۱۹۹۹ء میں ایک خصوصی مجلّہ ''نذرِ تابش'' میں یکجا کر دیا تھا۔ یہ مجلّہ حکومت پاکستان کی جانب سے تابش دہلوی کو ''تمغۂ امتیاز'' ملنے کی خوشی میں شائع کیا گیا تھا۔ نذرِ تابش میں شامل مضامین یقیناً بہت اہم ہیں لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ اب تک کسی نقاد نے تابش دہلوی کے شعری مقام و مرتبہ کے تعین اور موجودہ دور میں اُن کی شاعری کی اہمیت کے حوالے سے کوئی ایسا تجزیاتی مضمون تحریر نہیں کیا جو تابش دہلوی کی اُس فکری اور فنی مرکزیت کو دریافت کرے جو تابش دہلوی کو اردو کے اہم شعرا کی صف میں لے جا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ یہ ایک المیہ ہے کہ اب ہمارے نقادانِ کرام کو تقریباتی تحریریں اتنی فرصت ہی نہیں دیتی ہیں کہ وہ سنجیدہ اور اہم شاعری کے تجزیہ پر توجہ دیں سکیں۔

محترم نعیم میرٹھی نے یہ سبقت بھی حاصل کر لی کہ انھوں نے تابش صاحب کے تمام کلام کو یکجا کر کے پیشِ نظر کلیّات کی صورت میں محفوظ کر دیا۔ اس عمل میں جہاں محترم نعیم میرٹھی کی سعادت مندی کو دخل ہے وہاں اس کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ کلیّات آنے والے وقت میں شعر و ادب کے دلدادہ افراد کے ذوق کی تسکین کا ذریعہ ثابت ہوگ۔ کلیّات کسی شاعر کے احساس و اظہار تک رسائی کا ایک ذریعہ ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ کسی شاعر کی تخلیقی قوت کا ہشت پہلو آئینہ بھی ہوتا ہے اور یقیناً تابش دہلوی اس آئینہ میں اپنی جسمانی و جاہت، فطری ذہانت، فنی استقامت اور متخیلہ کی بھرپور قوت کے ساتھ پورے کھڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

شیراز زیدی☆

اردو فکشن — روایت تکنیک اور رجحانات

اردو فکشن کی عمر بہت زیادہ طویل نہیں ہے مگر اپنے ارتقائی دور میں اس نے ان تمام بلندیوں کو چھولیا ہے جو کسی بھی زبان کے ادب کو اعلیٰ مرتبہ عطا کرتی ہیں۔ اردو فکشن جس نے داستان ایسی سادہ صنفِ سخن سے جنم لیا آج بین الاقوامی دنیا کے ادب و فلسفے کو سمونے کر اپنے موضوعات و اسالیب میں اس قدر پیچیدہ ہو چکا ہے کہ اس کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے ہمیں موضوعات کے تنوع سے لے کر تکنیک کی نوعیت تک تمام مباحث کو گہرائی نظر کے ساتھ زیر بحث لانا پڑتا ہے، مگر اس کے باوجود امکان باقی رہتا ہے کہ فن پارے کا کوئی ایک یا زیادہ پہلو تشنہ بحث رہ گئے ہوں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ماضی کے اُدباء سادہ زندگی گزارنے اور کائنات کے بھیدوں پر اپنی حیرت کے اظہار میں مگن رہے لیکن مشینی دور کی ترقی کے ساتھ ساتھ زندگی میں بھی وہ سادگی باقی نہیں رہی اور اس مشین نے انسانی ذہن کو بھی پیچ در پیچ بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسی لیے آج ادیب کے ذہن کو سمجھنا اتنا سہل نہیں ہے جتنا ماضی میں تھا۔

اوّل اوّل ادیب کائنات اور انسان کے تعلق پر انگشت بہ دنداں رہے مگر آج کا ادیب ان مسائل کو حل کرنا اور انسان و کائنات کے تعلق کو سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ کبھی اپنی ذات کو بطورِ فرد سمجھنے کی کوشش کرتا اور کبھی خود کو سماج کے حوالے سے جاننا چاہتا ہے۔ فکشن تخلیق ہوتا رہا، ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا، اس میں نت نئے تجربات اور زندگی کے بڑھتے ہوئے مسائل کے ساتھ ساتھ موضوعاتی تنوع واقع ہوتا رہے گا، مگر اس بات کی ضرورت ہمیشہ رہے گی کہ سنجیدہ نقاد فکشن کی روایت اور جدیدیت کی ہم آہنگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ تعین کرتے ہیں کہ کونسا فن پارہ تجربات کے مرحلوں سے گزرنے کے بعد حقیقی معنوں میں فکشن رہتا ہے کیوں کہ تجربے کامیاب بھی ہوتے ہیں اور ناکام بھی، ہر تجربہ کامیاب نہیں ہو سکتا مگر جو کامیاب ہو جاتا ہے وہ سنگ میل کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے اس لیے ایک نقاد کا فرض اوّلین ہے کہ وہ کامیاب و ناکامیاب تجربات کی نشاندہی کرتا رہے۔

فکشن کے مباحث میں سب سے پہلے تو یہ طے کرنا ضروری ہے کہ فکشن ہے کیا۔ بلراج کومل تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''ہماری بدقسمتی ہے کہ لفظ فکشن کا کوئی مناسب ترجمہ اردو زبان میں موجود نہیں ہے۔ خالص لغوی مفہوم میں فکشن کے ذیل میں وہ بیانیہ نثری تحریریں رکھی گئی ہیں جن میں تخیلی و تخلیقی سطح پر واقعات،

☆ M-2/9، اسٹیل ٹاؤن، کراچی

مناظر اور کرداروں کی مدد سے زندگی کی نمائندگی کی کوشش کی گئی ہے۔ فکشن کے تحت آنے والی اصناف عام طور پر افسانہ، کہانی، حکایت، داستان اور ناول ہیں۔''(۱)

اس کے ساتھ ساتھ شمس الرحمٰن فاروقی کی یہ رائے بھی دیکھتے چلیے:

''اگر فکشن کی تعریف یا حد بندی ہو سکے تو ہم اسے ناول اور افسانہ دونوں کے لیے کام میں لاسکیں گے۔ فکشن کے بارے میں سب سے آسان بات یہ ہے کہ فکشن ان تمام طرح کے افسانوں سے الگ ہوتا ہے جن کا تعلق کم و بیش زبانی بیان سے ہے، لہٰذا داستان، عوامی کہانیاں، Fables بچوں کی کہانیاں Fairy Tales یہ فکشن نہیں ہیں۔ محض اس وجہ سے نہیں کہ اصلاً ان کا تعلق زبانی بیان سے ہے کیوں کہ بہت سی داستانیں وغیرہ لکھی بھی گئی ہیں یا انھیں زبانی سن کر لکھا جا سکتا ہے، بلکہ اس وجہ سے زبانی بیان کی تکنیک، اس کے فنی تقاضے اور ایک حد تک اس کی جمالیات جس طرح کی ہوتی ہے وہ ان تحریروں میں نظر نہیں آتی جنھیں ناول یا افسانہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اردو ہندی کے وہ قصے کہانیاں جو داستانی طرز کے ہیں اگرچہ وہ کبھی سنائے نہیں گئے بلکہ چھپ کی مقبول ہوئے ہیں۔ مثلاً حاتم طائی، چہار درویش، توتا مینا کی کہانی وغیرہ، وہ بھی فکشن نہیں ہے۔ تمثیلیں یعنی Allegories بھی فکشن نہیں ہیں۔''(۲)

درج بالا دونوں تعریفوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم اپنی توجہ ناول اور افسانے پر مرکوز رکھیں گے اور اصطلاحاً فکشن کے لیے ''افسانوی ادب'' کے الفاظ استعمال کریں گے مگر اس سے پہلے تمہیداً ایک نظر قصہ کہانی اور داستان پر بھی ڈالیں گے تاکہ ناول و افسانے کا ارتقا بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

دراصل انسان بنیادی طور پر متجسس واقع ہوا ہے۔ تجسّس کا مادہ اس کی فطرت میں موجود ہے۔ وہ ہر لمحے کسی نئی سے نئی کھوج اور نئی دنیا کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اسی لیے اسے کہانی سے بھی دلچسپی ہے کیوں کہ کہانی اس کے تجسس کو انگیخت کرتی ہے، اسے نئی دنیا کی سیر کراتی ہے اور پھر اس کے تجسس کی تسکین بھی کرتی ہے۔ کہانی سننے کا آغاز بچپن سے ہوتا ہے۔ یہ کہانیاں جن کی کوئی ادبی اہمیت نہیں ہوتی ان دیکھے جہانوں کی سیر کروا کر ہماری زندگی کو لمحاتی طور پر خوش گوار بنا دیتی ہیں۔ ان کہانیوں کا ماحول طلسمی اور کردار مافوق الفطرت ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ قصے اپنا ایک تہذیبی و سماجی پس منظر رکھتے ہیں۔ وہ قصے جو کسی قوم میں متداول چلے آتے ہیں خلا میں پیدا نہیں ہوتے، کلیم الدین احمد کے الفاظ میں:

''ان کی اس قوم کے شعور و تخیل سے آبیاری ہوتی ہے۔ ان میں اس قوم کے شعور کی پہلی معصوم تلاہٹ سنائی دیتی ہے۔ اسی آئینے میں بہت سی وہ چیزیں نظر آتی ہیں جن میں وہ قوم شروع سے دلچسپی لیتی تھی اور جو اس کی دماغی یا جذباتی قوتوں پر پُرزور محرکات کا کام کرتی تھیں۔ اسی آئینے میں

وہ سب باتیں نظر آتی ہیں جن میں اسے کامل یقین تھا اور جنھیں وہ واقعیت اور حقیقت کا جامہ پہناتی تھی... اسی آئینے میں وہ مافوق العادات ہستیاں، واقعات، چیزیں، وہم و گمان کے مرقعے، وہ مذہبی عقائد بھی اپنی جھلک دکھلاتے ہیں جنھیں وہ قوم صحیح سمجھتی تھی۔'' (۳)

اگرچہ قصہ کہانیوں سے کسی قوم کے ابتدائی تصورات و تخیلات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن اس کے باوجود ان کا ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہی معاملہ حکایات و تماثیل کا بھی ہے۔ قصوں کا تعلق ادب کے ساتھ داستان کی صورت میں قائم ہوتا ہے۔ داستان ایک ادبی صنف ہے کہانی کی طرح داستان بھی کردار منظر یا ماحول اور واقعات کے تسلسل کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کا نقطۂ آغاز، عروج اور انجام ہوتا ہے۔ اس میں بھی مافوق الفطرت کردار نظر آتے ہیں اور ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو ہماری عام زندگی کا تجربہ نہیں ہوتے، لیکن داستان اپنی ہیئت کئی کہانیوں سے مل کر بناتی ہے۔ اس کا حجم بہت زیادہ، کہانی طویل و پیچیدہ ہوتی ہے۔ قصہ در قصہ کی وجہ سے اس کا پلاٹ سادہ نہیں رہتا، اس کے باوجود بھی داستان کہانی سے مختلف نہیں ہوتی۔ کلیم الدین احمد مزید فرماتے ہیں:

''یہ بھی دل بہلانے کی ایک صورت ہے۔ اس میں بھی حقیقت و واقعیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس میں بھی اعلیٰ ادبی و فنی اصول کی کارفرمائی نہیں۔ اس کا مرتبہ دنیائے ادب میں بہت بلند نہیں۔ یہاں بھی جانور بولتے چالتے، چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں بھی ناقابل یقین واقعات و مناظر ملتے ہیں اور یہاں بھی مافوق الفطرت ہستیوں کے کرشموں سے سابقہ پڑتا ہے۔ الغرض داستانوں کی فضا کہانیوں کی فضا سے مختلف نہیں ہوتی اور یہ فضا اجنبی، حیرت انگیز ہوتی ہے۔ اس میں اور انسانی دنیا کی فضا میں فرق صاف نظر آتا ہے۔'' (۴)

اقوام میں جب عیش پرستی بڑھ جاتی ہے اور قوائے عمل سُست پڑ جاتے ہیں تو فرصت کا یہ دور داستانوں کے لیے سازگار ہوتا ہے۔ داستانوں کو عروج ایسے ہی دور میں حاصل ہوتا ہے۔ اردو داستانوں کو عروج بادشاہت کے دور میں حاصل ہوا، یہ دور عیاشیوں کا تھا جب پوری قوم حرکت و عمل سے بے نیاز ہو رہی تھی۔ لہٰذا جب ان کی عملی زندگی میں زوال آیا تو لوگوں کا یہ معمول بن گیا کہ سونے سے پہلے کوئی دلچسپ داستان سنتے اور سو جاتے۔ داستان گویا کہ ایک نشہ آور دوا بن گئی تھی جو حقیقت سے دور ایک خوابی دنیا میں پہنچا دیتی تھی۔ اردو میں بہت سی طویل و مختصر داستانیں لکھی گئی ہیں۔ داستانِ امیر حمزہ، بوستانِ خیال، الف لیلہ، باغ و بہار، فسانہ عجائب وغیرہ نے قبول عام حاصل کیا۔ یہ داستانیں مقفیٰ و مسجّع طرزِ تحریر میں بھی لکھی گئیں اور سلیس و رواں نثر میں بھی مگر ان کا موضوع اور فن یکساں تھا۔ داستان ایک اہم اور دلچسپ صنفِ سخن تھی مگر اسے عروج اسی دور میں حاصل رہا جب تک زندگی سہل رفتار سے گامزن رہی آج داستان ماضی کا قصہ بن چکی ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا کہ مشینی دور کی ترقی کے ساتھ انسانوں کی سوچ کے زاویے بھی بدل گئے۔ اب ادباء دنیا کو داخلیت کے ساتھ ساتھ خارجی حقیقت کے طور پر بھی پرکھنا چاہتے تھے۔ چناں چہ آنکھیں بند کر کے حقیقت سے فرار چاہنے کے بجائے دنیا کے

خارجی حقائق کو تسلیم کرنے کا رجحان پیدا ہو گیا۔ اس رجحان کی بدولت جب قصہ کہانی اور داستانوں کے واقعات میں مافوق الفطرت کردار اور واقعات غائب ہو گئے اور ان میں ہمیں اپنی دنیا کے عام لوگ دنیاوی مسائل سے دوچار نظر آنے لگے تو ناول وافسانے کے خدوخال نکھر گئے اور ہم داستانوں، قصہ کہانیوں کی بھول بھلیوں سے نکل کر حقیقی دنیا میں آ گئے۔

اردو میں ناول مغرب سے درآمد کیا گیا تھا۔ ناول فرانسیسی زبان کے لفظ Novella سے ماخوذ ہے۔ ناول کی راہ ہموار کرنے میں فرانس اور اٹلی کے ان قصوں نے اہم کردار ادا کیا جن کے کردار گھر سے باہر نکل کر مہم جوئی کرتے تھے اور زندگی کے مسائل سے دوچار ہوتے تھے۔ یہ واقعے حقیقی اور غیر حقیقی واقعات سے تشکیل پاتے تھے۔ انھی قصوں میں ناول کے ابتدائی خدوخال ظاہر ہوئے۔ بالاخر ۱۷۴۵ کے قریب وہ تحریریں سامنے آئیں جنھیں حقیقی معنوں میں ناول کہا جاسکتا ہے۔ مغرب میں ناول نگاری کی اولیت کا سہرا رچرڈسن اور ہنری فیلڈنگ کے سر جاتا ہے جن کے ناولوں ''پامیلا'' اور ''جوزف اینڈریوز'' نے فکشن کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ کشافِ اصطلاحاتِ تنقید میں ناول کی تعریف یہ کی گئی ہے۔

> ''ناول سے مراد سادہ زبان میں ایسی کہانی ہے جس میں انسانی زندگی کے معمولی واقعات اور روزانہ پیش آنے والے معاملات کو اس انداز میں بیان کیا جائے کہ پڑھنے والے کو اس میں دلچسپی پیدا ہو۔ یہ دلچسپی پلاٹ، منظرنگاری، کردارنگاری اور مکالمہ نگاری سے پیدا کی جاتی ہے اور یہی ناول کے بنیادی عناصر ہیں۔ ان میں پلاٹ اور کردارنگاری خاص طور پر اہم ہیں۔'' (۵)

اس تعریف سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناول داستان سے اس لیے مختلف ہے کہ داستان ایک خیالی اور مثالی دنیا کا نقشہ پیش کرتی ہے جب کہ ناول میں ہماری حقیقی اور خارجی دنیا کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ناول ایک فرضی قصہ ہونے کے باوجود ہماری حقیقی اور سماجی زندگی کو بیان کرتا ہے۔ اردو میں ناول نگاری کا سہرا ڈپٹی نذیر احمد کے سر سجایا جاتا رہا ہے اور ان کے ناول ''مراۃ العروس'' کو اولین ناول قرار دیا جاتا رہا ہے جو کہ ۱۸۶۹ کو منظر عام پر آیا۔ اگرچہ بعدازاں ''خطِ تقدیر'' کو پہلا ناول قرار دیا گیا ہے لیکن رجحان کے پیش نظر نذیر احمد کا ناول زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ نذیر احمد سرسید کے گروہ کے آدمی تھے۔ اس لیے ''اصلاح'' اُن کے پیش نظر تھی۔ اس وجہ سے انھوں نے لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کے لیے ''مراۃ العروس'' تحریر کیا۔ اس ناول میں ہمیں اس دور کی تہذیب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور کردار و واقعات خلافِ فطرت نہیں ہیں اگرچہ کردار ''ٹائپ کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ خاصیت نذیر احمد کے تمام ناولوں میں موجود ہے۔ ان کے کردار کی فطرت تبدیل نہیں ہوتی، وہ شریف ہیں یا بدمعاش، انسان ہیں یا شیطان شروع سے آخر تک ایک جیسے رہتے ہیں۔ زندگی کی بھرپور نفسیاتی ترجمانی نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے ناولوں میں جھول نظر آتا ہے۔ دوسرا اہم ناول رتن ناتھ سرشار کا ''فسانۂ آزاد'' ہے جو ۱۸۸۰ء میں کتابی شکل میں آیا۔ یہ داستان اور ناول کے درمیان کی چیز ہے۔ مگر چوں کہ داستانوں کا رنگ ابھی پوری طرح صاف نہیں ہوسکا تھا، اس لیے فوق الفطرت واقعات وکردار ''فسانۂ آزاد'' میں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عبدالحلیم شرر کا ناول ''ملک العزیز ورجینا'' میں بھی قابلِ ذکر ہے جس کی اشاعت ۱۸۸۸ء میں پرچہ ''دلگداز'' میں شروع ہوئی۔ عبدالحلیم شرر نے والٹراسکاٹ کے ناول

Talisman کے ردعمل میں ناول لکھنے شروع کیے۔ اسکاٹ نے صلیبی جنگوں کی آڑ میں صلاح الدین ایوبی کی جو متعصّبانہ کردار سازی کی اس نے عبدالحلیم شرر کا رُخ تاریخ کی طرف موڑ دیا۔ اس لیے انھوں نے اپنے اس ناول کی تکمیل کے بعد اپنے خیالات کا جو اظہار کیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے تاریخی کاموں کے ذریعے قوم میں غیرت وحمیت پیدا کرنا چاہتے تھے۔(۶) اس سے اُن کی ناول نگاری کا مقصد واضح ہو جاتا ہے۔ شرر کے تمام ناول رومانی تاریخ سے لبریز ہیں۔ مربوط پلاٹ، دلچسپ واقعات اور زبان کی رنگینی شرر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

ان ابتدائی ناولوں میں قصے کی دلچسپی اور زبان کی شائستگی کو اہمیت حاصل ہے۔ پلاٹ میں بھی سرشار کے ہاں داستان کی سی پیچیدگی ہے مگر نذیر اور شرر کے ناولوں کے پلاٹ بالکل سادہ اور مربوط واقعات پر مشتمل ہیں۔ نذیر اور شرر کے ناول تو باقاعدہ افادی نقطۂ نظر کے تحت لکھے گئے۔ البتہ مرزا ہادی رسوا کا ناول ''امراؤ جان ادا'' جو کہ ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا، ایسا ناول ہے جسے مکمل ناول کہا جاسکتا ہے۔ بالخصوص جب اس بات کو ذہن نشین رکھا جائے کہ رسوا نے یہ ناول اس وقت تحریر کیا جب کہ ناول ابھی گھٹنوں کے بل چلنا سیکھ رہا تھا۔ اسی ناول میں نفسیاتی، اجتماعی اور کرداری ناول کی خصوصیات بیک وقت پیدا ہوگئی ہیں۔ رسوا نے اس ناول میں اپنے کردار طوائف امراؤ جان ادا اور ان تمام کرداروں کی نفسیات کو جو اس سے منسلک ہیں، بڑی خوبی سے آشکار کیا ہے۔ جب کہ نانم کا ڈیرہ ایک تہذیب کا عکاس بن کر سامنے آتا ہے جو طوائفوں کے کوٹھوں پر روحانی سکون کی تلاش میں تھی۔ اس لیے اس ناول کی اجتماعی حیثیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اگر ''امراؤ جان ادا'' کے کرداروں میں انفرادیت کی ذرا بھی کمی رہ جاتی تو یہ مکمل طور پر اجتماعی ناول نہیں بن پاتا، اور چوں کہ اس کے تانے بانے مضبوط کرداروں کی تشکیل سے بُنے گئے ہیں اس لیے یہ ایک کرداری ناول بھی ہے۔

راشد الخیری اور پریم چند نے بھی ناول لکھے، راشد الخیری کے ناول عورتوں کی مظلومیت کی داستانیں ہیں مگر ان کا اصلاحی جذبہ، خطابیہ انداز اور اکتا دینے والی یکسانیت انھیں ناول نگاری کے بڑے درجے سے محروم کر دیتی ہے۔ جب کہ پریم چند ان ناول نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے ناول کو وسعت عطا کی۔ ان کے ناولوں میں ''گئودان'' اور ''گوشۂ عافیت'' اہمیت کے حامل ہیں۔ پریم چند کی یہ خصوصیت قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے ماحول اور مقامی رنگ سے ناولوں کو سجایا۔ ان کے کردار نہ شیطان ہیں نہ فرشتے، ان میں اچھائی اور برائی دونوں طرح کی خاصیتیں موجود ہیں اسی لیے وہ بہت جلد انقلابات کو قبول کر لیتے ہیں۔ رسوا اور پریم چند کے ناولوں میں حقیقی سماجی زندگی کا جو عکس اُبھرتا ہے، وہی ناولوں کی جان ہے۔ بعدازاں ناول کی دنیا میں ایسے نام سامنے آتے ہیں جنھوں نے اپنی جودت طبع کی بدولت ناول کو تجربات ورجحانات سے آفاقیت عطا کی۔ ان میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، عزیز احمد، قرۃ العین حیدر، فضل کریم فضلی، شوکت صدیقی، جمیلہ ہاشمی، ممتاز مفتی، خدیجہ مستور، احسن فاروقی، انتظار حسین، عبداللہ حسین، اور بانو قدسیہ وغیرہ اہم ہیں۔

ناول زندگی کو ایک وسیع تناظر میں دیکھ رہا تھا مگر زندگی کی جزیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی کے ہزاروں پہلو جزوی ہونے کے باوجود اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کیوں کہ پورا سماج اُن سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی نقطہ نظر نے افسانے کو جنم دیا۔ افسانہ زندگی کے کسی ایک پہلو کی ترجمانی کرتا ہے۔ افسانہ ناول سے اسی لیے مختلف ہے کہ افسانے میں زندگی کے صرف ایک پہلو کی نقاب کشائی کی

جاتی ہے اور ناول میں زندگی کے بہت سے گوشوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ افسانہ گویا ایک آئینہ ہے جس میں چہرے کی صرف ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ وحدت تاثر افسانے کی جان ہے۔ افسانہ ختم ہونے پر کوئی ایک کردار یا تاثر ہمارے ذہن میں رہ جاتا ہے۔

ناول کی طرح افسانہ بھی مغرب سے درآمد کیا گیا اور تیزی سے مقبول ہوتا گیا۔ اردو میں افسانے کی ابتدا سجاد حیدر یلدرم نے کی۔ انھوں نے ۱۹۰۱ء میں پہلا افسانہ ''نشہ کی ایک ترنگ'' لکھا(۷) یلدرم سے پہلے بہت عرصے تک پریم چند کے افسانے ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' جو کہ ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا پہلا افسانہ قرار دیا جاتا رہا۔(۸) افسانے کے ابتدائی دور میں یلدرم اور پریم چند رومانی اور اصلاحی رجحانات کے دو نمائندے قرار دیے جاسکتے ہیں۔ یلدرم بنیادی طور پر رومانوی افسانہ نگار تھے۔ ان کے افسانوں میں تخیل کی آزاد پرواز اور جذبہ کی شدت نظر آتی ہے۔ جب کہ پریم چند حقیقت پسند افسانہ نگار تھے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''سوز وطن'' ہے جو ۱۹۰۷ء میں نواب رائے کے نام سے شائع ہوا مگر اس کو سرکار نے بغاوت کے عناصر دیکھ کر ضبط کرلیا۔ اس میں انھوں نے وطن دوستی کے جذبات اُبھارنے کی کوشش کی تھی۔ اس ابتدائی دور کے بعد ان کے جو افسانے شائع ہوئے ان میں وہ موضوع اور فن کے لحاظ سے کمال کو پہنچ گئے۔ اُن کے افسانوں میں سماجی مسائل کی تلخ حقیقت نگاری نظر آتی ہے۔ پریم چند کا افسانہ ''کفن'' اس کی نمائندہ مثال ہے۔ پریم چند اور یلدرم کے بعد افسانہ نگاروں کی ایک بڑی کھیپ نظر آتی ہے۔

ہمیں اپنے ابتدائی افسانوی ادب میں حقیقت نگاری اور رومانیت کے رجحانات نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں رومانیت اور حقیقت کا امتزاج بھی ملتا ہے۔ اگرچہ زمانے کے ساتھ ساتھ نت نئی تحریکیں اور رجحانات سامنے آئے مگر ممتاز شیریں کے اس نظریے کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ:

> ''ادب میں نئی نئی تحریکیں اور ہر آن بدلتے رجحانات بھی ایک خاص دائرے میں گھومتے ہیں جو تحریک یا رجحان نیا معلوم ہوتا ہے، وہ دراصل ایک گزشتہ رجحان یا تحریک ہی کی ایک نئی شکل ہوتی ہے، سوئی گھوم کر برابر انھی نکتوں پر آتی رہتی ہے اور رجحانات کا ایک دائرہ سا بن جاتا ہے۔ صدیوں سے رومانٹیسزم اور کلاسزم کا چکر برابر قائم رہا ہے اور اب بھی کئی مختلف ناموں سے داخلیت اور خارجیت کا چکر جاری ہے۔''(۹)

رجحانات ادب میں کسی خاص موضوع کی جانب میلانِ طبع کو ظاہر کرتے ہیں۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ ہمارے ابتدائی افسانوی ادب میں حقیقت نگاری اور رومانیت کے رجحانات سے ملتے ہیں۔ حقیقت نگاری اپنا مواد سماج سے حاصل کرتی ہے۔ یہ سماج کی برائیوں کو بیان کرتی ہے یا ان کی اصلاح کی سعی و کوشش کرتی ہے، یا دونوں کام بیک وقت سرانجام دیتی ہے۔ مثلاً ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں اصلاحی رجحان پایا جاتا ہے مگر جب سماج کی تلخ حقیقت ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو داخلیت کی طرف جھکاؤ بڑھ جاتا ہے۔ ان دیکھی دنیا بسانے کی خواہشات جنم لیتی ہیں جہاں ہم اپنی آرزوؤں کی تکمیل دیکھتے ہیں۔ دنیا کی تلخ حقیقت سے فرار پانے، ایک خوابی اور رنگین دنیا بسانے کی خواہش رومانوی رجحان کو جنم دیتی ہے۔ جیسے یلدرم کے افسانوں میں محبت کے خیالی جزیرے سماجی

حقائق کی اذیتوں سے کچھ دیر کے لیے ہمیں بیگانہ کر دیتے ہیں۔

رجحانات کی تشکیل اور تشکیلِ نو دراصل معاشرے کے سیاسی و معاشی عوامل پر انحصار کرتی ہے۔ جب معاشرے کے حالات بدلتے ہیں تو خیالات اور نظریوں میں بھی تبدیلی واقع ہوتی ہے جو رجحانات کو جنم دیتی ہے۔ بقول ڈاکٹر ممتاز احمد خان:

> ''جب حالات بدلتے ہیں تو نئے نئے خیالات اور نظریات پیدا ہوتے ہیں معیارات بدلتے ہیں، اقدار کی صورتیں بھی بدلتی ہیں اور ان بدلتے حالات میں ایک رجحان پرورش پانے لگتا ہے جو اکثر غالب آ جاتا ہے اور ادیبوں کی اکثریت اس غلبے کے تحت لکھنے لگتی ہے۔ یہ علاحدہ بات ہے کہ کوئی رجحان کتنے عرصے جاری رہتا ہے۔ اس میں بھی حالات کی تبدیلی اور نئے نئے نظریات و خیالات کے ابھر آنے کا دخل ہوتا ہے اور ایک نیا رجحان وجود میں آ جاتا ہے۔''(۱۰)

اردو کے افسانوی ادب میں رومانوی و عشقیہ، تہذیبی، تاریخی و سیاسی، آدرشی، نفسیاتی و جنسی، فنتسیائی، ناسٹلجیائی، مزاحیہ، خودسوانحی، تجرباتی رجحانات عام نظر آتے ہیں۔ ہر رجحان ایک خاص دور میں سامنے آتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ثانوی رجحانات بھی موجود رہتے ہیں۔ رومانویت انسان کی فطرت میں شامل ہے وہ بھی کبھی کبھی خارجی دنیا کی یکسانیت سے اُکتا کر ایک خوابی دنیا میں سکون کے چند لمحات گزارنا چاہتا ہے۔ داستان سے لے کر جدید افسانے اور ناول تک رومانیت کی لہر افسانوی ادب میں جاری و ساری ہے۔ لیکن خالص رومانوی و عشقیہ رجحانات کے ناول یا افسانے سنجیدہ ناولوں اور افسانوں کے مدمقابل نہیں ہو سکتے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں زندگی کے سنجیدہ مسائل کی بجائے ایک مخصوص فضا ہوتی ہے جس میں مواد اور اسلوب کے تنوع کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ یلدرم سے لے کر آج بشریٰ رحمان تک ان ناولوں اور افسانوں کے موضوعات و اسالیب مشترک ہیں جب کہ ان میں بقول ڈاکٹر ممتاز احمد خان زندگی کی بصیرت کم ہے۔(۱۱)

اس کے برعکس حقیقت پسندانہ ناول اور افسانے زندگی کی بصیرت سے لبریز ہوتے ہیں۔ ان میں زندگی کے تلخ حقائق سے نظریں ملا کر انھیں اپنے موافق ڈھالنے کی سعی کارفرما ہوتی ہے۔ پریم چند کے افسانوں سے لے کر شوکت صدیقی کے ''خدا کی بستی'' تک دنیا کی حقیقت خواہ وہ تلخ ہے یا شیریں ان ادیبوں کا موضوع ہے۔ تہذیبی رجحان کے حامل ناول یا افسانے ان خطوں کی تہذیبوں سے اپنا مواد حاصل کرتے ہیں جہاں کی تہذیب کسی خاص مقام کی حامل ہو۔ برصغیر میں حیدرآباد دکن کو ایک خاص تہذیبی مقام حاصل رہا ہے، اسی طرح لکھنوی تہذیب میں بھی ممتاز اہمیت کی حامل تھی۔ رسوا کا ناول ''امراؤ جان ادا'' لکھنوی تہذیب کی عکاسی کرتا ہے اور عزیز احمد ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' حیدرآباد دکن کی زوال آمادہ تہذیب کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ افسانوں میں واجدہ تبسم کے افسانے تہذیبِ دکن کے آئینہ دار ہیں۔

نفسیاتی و جنسی میلان فرائڈ اور ژونگ کے اثرات کے نتیجے کے طور پر سامنے آیا۔ اردو ناولوں میں رسوا نے طوائفوں کی نفسیات بیان کی، ترقی پسندی کے دور میں جنس نگاری کو بھی اہمیت حاصل ہوگئی۔ ''انگارے'' میں افسانہ نگاروں کی جنسی گھٹن کے خلاف بغاوت

نظر آتی ہے، عزیز احمد نے گریز اور عصمت چغتائی نے ٹیڑھی لکیر ایسے ناول تحریر کیے اور منٹو نے جنسیت نگاری کو کمال پر پہنچا دیا۔

آدرشی ادب کی تخلیق نثار عزیز بٹ، جمیلہ ہاشمی اور قرۃ العین حیدر کے ہاں دیکھی جا سکتی ہے۔ آدرش پسندی کا رجحان زیادہ تر خواتین کے ہاں نظر آتا ہے جن کے مثالی کردار اپنے اصولوں کی خاطر زندگی کو تج دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ جمیلہ ہاشمی کے ناول ''تلاش بہاراں'' کی کنول کماری اور قرۃ العین حیدر کے ناول ''آخری شب کے ہمسفر'' کی دیپالی سرکار آدرشی رجحان کے نمائندہ کردار ہیں۔

تاریخی رجحان کا آغاز عبدالحلیم شرر کے ناولوں سے ہوتا ہے۔ انھوں نے اسلامی تاریخ کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ اس کے بعد نسیم حجازی اور رئیس احمد جعفری کے ناولوں نے شہرت حاصل کی۔ قرۃ العین حیدر اور احسن فاروقی نے بھی اپنے ناولوں میں تاریخ کو موضوع بنایا۔ تاریخی رجحان ناولوں تک ہی محدود رہا کیوں کہ اس کے لیے ایک وسیع میدان کی ضرورت ہوتی تھی جو افسانے کی حدود سے ماورا تھا۔

سیاسی رجحان ناولوں اور افسانوں پر چھایا رہا۔ سیاست کو افسانوی ادب میں اہمیت عالمی جنگوں کی بدولت حاصل ہوئی۔ جب ادیبوں نے اپنی آنکھوں سے انسانیت کی تذلیل اور سماجی لوٹ مار کو دیکھا تو ان موضوعات پر قلم اُٹھایا۔ پریم چند سے لے کر آج تک کسی نہ کسی حوالے سے سیاست کی گونج افسانوی ادب میں سنائی دے جاتی ہے۔ بالخصوص جب تقسیم ہند اور سقوطِ بنگال کا دکھ بھی شامل ہوگیا تو سیاسی رجحان کا اثر اور بڑھ گیا۔ اس کی ترویج و ترقی کا سہرا ترقی پسندوں کے سر جاتا ہے۔ حیات اللہ انصاری کے ضخیم ناول ''لہو کے پھول'' خدیجہ مستور کے ''آنگن''، عبداللہ حسین کے ''اداس نسلیں'' تک سیاسی کشمکش کا دھارا ادب میں بہتا رہا ہے، حتیٰ کہ منٹو کے ہاں بھی ''نیا قانون'' اور ٹوبہ ٹیک سنگھ ایسے لازوال افسانے تخلیق پانے لگتے ہیں۔

مزاح نگاری کی طرف بھی ادبا کا میلانِ طبع آغاز سے نظر آتا ہے۔ سرشار کے ناولوں کے مزاحیہ کردار اور ''اودھ پنچ'' کے منشی سجاد حسین ناول ''حاجی بغلول'' اور ''احمق الدین'' اس کی مثالیں ہیں۔ بعدازاں عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی مزاحیہ رجحان کے نمائندوں کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ پطرس بخاری کے افسانہ نما مضامین بھی اسی رجحان کے ترجمان ہیں۔

ڈاکٹر ممتاز کہتے ہیں کہ ناسٹلجیائی رجحان تقسیم ہند کے بعد اردو کے افسانوی ادب میں نظر آتا ہے دردناک خواہش ہے۔ اسے ماضی کا شدید احساس بھی کہا جا سکتا ہے۔ ماضی میں ناسٹیلجیا سپاہیوں کی وطن جانے کی شدید خواہش کے حوالے سے ایک بیماری تصور کی جاتی تھی مگر اب یہ ماضی کی خوشگوار یادوں کا استعارہ بن چکی ہے۔(۱۲) اردو ادب میں ہجرت کے دکھ نے ناسٹیلجیائی کو جنم دیا۔ انتظار حسین کے ناول ''بستی'' اور ''تذکرہ'' اس رجحان کو ظاہر کرتے ہیں۔

فنتاسی کا رجحان بھی اردو کے افسانوی ادب میں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ فنتاسی عجیب و غریب کرداروں اور مافوق باتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ فینٹسی سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہمیں کچھ دیر کے لیے ان باتوں پر یقین کرنا پڑتا ہے۔(۱۳) ایسے عجیب و غریب اور مافوق الفطرت کرداروں کی تخلیق میں کرشن چندر، خالد اختر اور حجاب امتیاز علی کے نام نمایاں ہیں۔ کرشن چندر کے

ناول ''وائلن سمندر کے کنارے'' میں ''کیشو'' کا دیواری مجسمہ ایلورا کے غاروں سے نکل کر دنیا میں آجاتا ہے اور خالد اختر کے ناول ''چاکیواڑہ میں وصال'' کے عجیب وغریب فاترالعقل کرداروں کردار فینٹسی کی تشکیل کرتے ہیں۔ فینٹسی کا مسئلہ موضوع سے زیادہ تکنیک کا ہے۔ افسانوی ادب میں تجرباتی رجحان کا تعلق تکنیک وہیت کے مسائل سے رہا ہے۔ ممتاز شیریں فرماتی ہیں:

> ''تکنیک کی صحیح تعریف ذرا مشکل ہے۔ مواد، اسلوب اور ہیئت سے ایک علاحدہ صنفِ فنکار مواد کو اسلوب سے ہم آہنگ کر کے اسے ایک مخصوص طریقے سے متشکل کرتا ہے۔ افسانے کی تعمیر میں جس طریقے سے مواد ڈھلتا جاتا ہے۔ وہی تکنیک ہے۔'' (۱۴)

ممتاز شیریں نے تکنیک کو واضح کرنے کے لیے برتن کی مثال پیش کی ہے۔ برتن بنانے کے لیے مٹی کی ضرورت پڑتی ہے، اسے مواد اور رنگ ملانے کو ''اسلوب'' سمجھ لیجیے، پھر مٹی اور رنگ کے اس مرکب کو توڑ موڑ کر کہیں سے گول کہیں سے چوکور کر کے مخصوص شکل نکالنے تک کا عمل تکنیک ہے اور جو شکل برآمد ہوتی ہے وہ ہیئت ہے اور جو چیز پیدا ہوگی وہ ''افسانہ'' افسانے اور ہیئت میں فرق یہ ہے کہ ہیئت، مکمل شکل ہوگی اور افسانہ مکمل چیز ہے جیسے کہ چینی اور مٹی کے برتن شکل میں ایک جیسے ہو سکتے ہیں مگر بطور چیز مختلف ہوں گے۔ (۱۵)

زندگی میں تنوع کے ساتھ ساتھ افسانوی ادب میں بھی موضوعاتی و تکنیکی تنوع جاری وساری ہے۔ کچھ ناول یا افسانے صیغوں کی تکنیک میں لکھے جاتے ہیں جن میں کہانی بیان کرنے والا مرد یا عورت، غائب یا حاضر ہوتا ہے۔ مثلاً ممتاز مفتی کے افسانے ''آپا'' میں آپا کی کہانی آپا کی بہن چھینا بیان کرتی ہے۔ کچھ میں مصنف حالات کی تصویر کشی کرتا یا کہانی مصنف کی زبانی بیان ہوتی ہے۔ جیسے غلام عباس کا افسانہ ''آنندی'' اور کہیں مصنف کے بیان میں عمل اور مکالمہ باہم مل کر کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ زیادہ تر افسانے اور ناول اسی تکنیک میں لکھے گئے ہیں۔ کہیں صرف گفتگو یا مکالمہ کہانی کو آگے بڑھاتا ہے۔ کچھ ناول یا افسانے خطوط کے ذریعے بھی مکمل کیے جاتے ہیں۔ خطوط جو واقعات کے تسلسل میں مددگار ہوتے ہیں باہم مل کر کہانی کو مکمل کرتے ہیں۔ راجہ انور کا ناول ''جھوٹے روپ کے درشن'' اس کی مثال ہے جس میں محبوبہ کے نام لکھے گئے خطوط کو جوڑ کر ناول بنایا گیا ہے۔ کہیں کرداروں کی خودکلامی کی تکنیک کہانی مکمل کرتی ہے مگر اب تکنیک کا معاملہ اس قدر سادہ نہیں رہا۔ شعور کی رو، آزاد تلازمہ خیال، علامت نگاری اور مغربی تحریکوں وجودیت، اظہاریت، رمزیت وغیرہ کے زیر اثر تکنیک میں اتنی پیچیدگیاں پیدا ہو چکی ہیں اور یہ سوالات پیدا ہو رہے ہیں کہ آیا ناولوں افسانوں میں پلاٹ اور کہانی پن ضروری ہے یا نہیں؟ شعور کی رو Stream of Consciousness کی تکنیک میں ماضی، حال اور مستقبل آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں ممتاز شیریں نے لکھا ہے کہ حال سے ماضی، ماضی سے حال جس طرف بھی مصنف کا ذہن چاہے کہانی کو موڑ سکتا ہے۔ پہلے واقعے کا بعد میں اور بعد کے واقعے کا پہلے بیان کیا جاسکتا ہے۔ واقعات کے بیان میں بھی وقت کا تسلسل قائم نہیں رہتا۔ (۱۶) ہمارے ہاں حسن عسکری نے اپنے افسانوی میں اس تکنیک کو خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر بھی اس تکنیک کو استعمال کرتی ہیں۔ ''آگ کا دریا'' میں شعور کی رو کارفرما نظر آتی ہے۔

ممتاز شیریں لکھتی ہیں کہ آزاد تلازمہ خیال بھی ذہنی ساخت کی تصویر کشی ہے۔ ذہن میں آنے والے بے ربط خیالات جن میں

ایک تسلسل بھی ہوتا ہے اور ہر خیال کی دوسرے خیال کے ساتھ کوئی نہ کوئی کڑی ملتی ہے۔ ناول یا افسانے کی تشکیل کرتے ہیں۔ ایک یاد کے بعد دوسری اور دوسری سے تیسری خیالات کا سلسلہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے اور جب افسانے کا انجام سامنے آتا ہے تو سوچنے والا خود بھی حیران ہو جاتا ہے۔ اس میں پلاٹ اور کردار نہیں بلکہ سوچنے والا اہم ہوتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سوچنے والا نہ ہو اور خود مصنف اپنا تلازمِ خیال پیش کرے۔(۱۷) قرۃ العین حیدر کے افسانے ''آہ اے دوست'' میں اسی تکنیک کا استعمال ہے۔

بقول محمود ہاشمی علامت نگاری کی تکنیک کو پہلی بار ممتاز شیریں نے اپنے افسانے ''میگھ ملہار'' میں استعمال کیا۔(۱۸) گوپی چند نارنگ کہتے ہیں کہ علامت نگاری میں ٹھوس کرداروں کا کام تمثیلوں اور علامتوں سے لیا جاتا ہے۔ یہ علامتیں ایک طرح استعاروں کا کام کرتی ہیں جن کے ذریعے معنوی تہہ داری پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض افسانوں میں خاص علامتوں کا استعمال فضا بنانے یا تاثر اُبھارنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔(۱۹) بانو قدسیہ کا ناول ''راجہ گدھ'' اس کی مثال ہے۔ ایسے افسانوں یا ناولوں کو لغوی اور علامتی دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے۔

اردو کے افسانوی ادب پر مغرب کی جو تحریکیں اثر انداز ہوئی ہیں ان میں اظہاریت یا باطن نگاری (Expressionism) کی تحریک بھی ہے۔ اظہاریت شعور کی رو سے مختلف چیز ہے ممتاز شیریں کہتی ہیں کہ اس تحریک کا سب سے بڑا نمائندہ اطالوی مصنف پیراندیلو ہے۔ اظہاریت میں ذہن خاص قسم کے تصورات کو دیکھتا ہے جو دیکھنے والے کو دنیا کے حقائق سے دور لے جاتے ہیں۔ یہ تصویریں جو کہ حقیقت میں وجود نہیں رکھتیں ذہن ایک خاص کیفیت میں دیکھتا ہے۔(۲۰) عزیز احمد کے ''چھوٹا خواب'' اور منٹو کے ''فرشتہ'' میں اظہاریت موجود ہے۔

حفیظ صدیقی لکھتے ہیں کہ وجودیت Existentialism کیر کے گارد اور ژاں پال سارتر کا فلسفہ ہے۔ وجودیوں کے نزدیک انسان کا بنیادی مسئلہ اس کا وجود ہے جو تنہا ہے مگر بحیثیت انسان اسے جینا اور اپنی انفرادیت کا تحفظ کرتا ہے۔ اسی کوشش میں اسے خود آگہی کے تکلیف دہ عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ وجودیوں کی تحریروں میں قنوطیت ملتی ہے ان کے نزدیک آدمی ہمیشہ پراگندہ حال، حسد، حرص اور خود غرضی جیسی بے معنوی صورت حال سے دوچار رہتا ہے اور یہ اس کا مقدر ہے۔(۲۱) وجودیت ایک داخلی تحریک ہے۔ وجودیوں کے نزدیک چوں کہ وہ تمام اصول جن کے ذریعے ہم واقعات کی تنظیم و تفہیم کرتے ہیں بے معنی اور بے بنیاد ہیں۔ اس لیے وجودی ادبا واقعات کے تسلسل یا ربط کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ وہ اشاروں، رمزوں اور علامتوں سے اپنے وجود کی تفہیم چاہتے ہیں۔ روایتوں کی شکست و ریخت وجودیوں کا خاصا ہے۔ انیس ناگی کا ناول ''دیوار ے پیچھے'' وجودیت کا ترجمان ہے۔ اسے انھوں نے شعوری طور پر وجودی بنانے کی کوشش کی ہے اور آغاز، انجام اور کردار کے میکانکی ارتقا کے تصور سے انحراف کیا ہے۔

انیس ناگی نے ''دیوار کے پیچھے'' میں ایک پروفیسر کی کہانی بیان کی ہے جو کہ لاپتہ ہو جاتا ہے۔ پہلے باب میں پروفیسر کے دوست احمد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر نے خودکشی کی کوشش کی تھی لیکن وہ مرا نہیں تھا۔ جب وہ اس کے گھر پہنچا تو وہ اس کے لیے ایک کاغذوں کا بنڈل چھوڑ گیا تھا (جو کہ دیوار کے پیچھے کی بنیاد بنا) ایک تحریر اس میں احمد کے نام موجود تھی۔ واضح رہے کہ

خودکشی کا رجحان وجودیوں کی خصوصیت ہے۔ فرانسیسی ادیب البر کامیو لادینی وجودیت کا علمبردار تھا۔ اس کے نزدیک واحد فلسفیانہ مسئلہ خودکشی کا مسئلہ تھا۔(۲۲) پروفیسر نے احمد کے نام جو خط تحریر کیا اس میں قنوطیت، مایوسی اور زندگی سے فرار کا اظہار واضح ہے۔ وہ زندگی کے اس سفر کو جہنم کا سفر کہتا ہے اور موت کی آغوش میں پناہ ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ احمد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر اسکول کے زمانے سے ہی زود رنج اور حساس تھا۔ وہ ایک ایسی شخصیت ہے جسے حق گوئی کا جنون ہے۔ یہ دنیا اگرچہ حق گوئی کے گیت الاپتی ہے مگر حق کو پسند نہیں کرتی، پروفیسر اس ناول میں حق گوئی کی علامت ہے۔ اپنی بہن کی شادی سے پہلے، بعد میں پیش آنے والی خانگی پیچیدگیوں کے خوف سے جب وہ ہونے والے بہنوئی کو یہ بتا دیتا ہے کہ اس کی بہن مرگی کی مریض ہے تو اس حق گوئی کے عوض اسے اپنی ماں اور بھائیوں کی ناراضگی براشت کرنی پڑتی ہے جو کہ پہلے ہی اس کے طرزِ زندگی سے نالاں رہتے ہیں۔ دوسری بہن کی شادی بھی محض اسی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہے کہ ہونے والے بہنوئی کو اس کے کارناموں کا علم ہو جاتا ہے۔ پروفیسر ایک ایسا شخص بن جاتا ہے جس کی حق گوئی اس کے خاندان کے لیے خطرہ بن جاتی ہے۔ بالآخر حالات کا جبر اسے لوگوں کو بلیک میل کرنے، اُن کے خلاف مخبری کرنے اور جھوٹی گواہیاں دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ پروفیسر کے یہ خیالات کہ میں صداقت کا اعلان کس کے لیے کروں؟ آیا اُن لوگوں کے لیے جنھیں سچائی کی ضرورت نہیں؟ اس کی حالات کے جبر کے تحت کایا پلٹ کو ظاہر کرتے ہیں۔ مگر اس کا ضمیر مردہ نہیں ہے وہ حالات کے جبر کو قبول کرتا ہے اور پھر تھک ہار کر خودکشی کر کے اس لایعنی اور بے مقصد زندگی کی قید سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ خودکشی اس کے لیے ایک آسان فعل ہے۔ وہ دریا میں کود کر خودکشی کی کوشش کرتا ہے پر اسے بچا لیا جاتا ہے تاکہ اس پر خودکشی کا مقدمہ چلایا جا سکے۔ اب اس پر یہ بھید کھلتا ہے کہ انسان کتنا مجبور ہے کہ خودکشی بھی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا وہ اپنی داستان تحریر کر کے لاپتہ ہو جاتا ہے۔

اس ناول میں ناگی نے فرسودہ نظامِ عدل پر گہری چوٹ کی ہے اور اسے تباہی کی علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ ناول میں تاریخ کی طرف خفیف اشارے بھی موجود ہیں اور یہ اشارے بھی ملتے ہیں کہ حق گوئی اور سچ پرستی سے فرار قوموں کی شکست کا باعث بن جاتا ہے۔ ''دیوار کے پیچھے'' کو کچھ ناقدین نے اینٹی ناول بھی قرار دیا۔ اس کی وجہ روایتی اسلوب سے ناگی کا گریز ہے۔ کئی مقامات پر منظر، مکالمے اور بیانیے آپس میں مل گئے ہیں۔ جابجا ہیرو کے خیالات ''خودکلامی'' کی تکنیک میں پیش کیے گئے ہیں جس کی وجہ سے واقعات کا زمانی تسلسل ٹوٹ گیا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان اس ناول کے اسلوب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

> ''اس ناول میں ماضی، حال اور مستقبل ایک ساتھ ملتے ہیں، لیکن کہانی جھول نہیں کھاتی۔ اس طرح ان کا اسلوب نئی تکنیک کے ساتھ وجود میں آتا ہے اور اتنا گھمبیر بھی نہیں ہوتا کہ کہانی سمجھنے میں دشواری ہو۔ روایتی قاری بھی ذرا سی قوتِ برداشت کے ساتھ کہانی کا لطف لے سکتا ہے۔''(۲۳)

علامتیت، وجودیت اور اظہاریت کی طرح سرریلزم کی تحریک نے بھی اردو ادب کو متاثر کیا ہے۔ ممتاز شیریں لکھتی ہیں کہ اس تحریک کا آغاز ۱۹۱۹ میں ہوا سرریلسٹ خیالات کی رو کو اصل شکل، اصل حالت میں پیش کرنے پر زور دیتے ہیں جیسے کہ وہ کسی عقلی ترتیب اور جمالیاتی یا اخلاقی رکاوٹ کے بغیر انسانی دماغ میں جاری و ساری رہتے ہیں۔ رمزیت کا پیش رو فکشن میں امریکی ناول نگار

ہرمن ویل تھا مگر جدید رمزیت کا آغاز کافکا کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ ہمارے فکشن پر آغاز ہی سے سرریلزم کے اثرات نظر آتے ہیں۔ احمد علی کی تحریریں اس کی مظہر ہیں۔ جدید افسانے کی سب سے پہلی کتاب ''انگارے'' میں بھی احمد علی کے افسانوں میں سرریلزم اور آزاد تلازمہ خیال موجود ہے۔(۲۴)

تکنیکی و موضوعاتی تجربات کی تمام اقسام سے بحث کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔ صرف چند اہم اقسام کو زیر بحث لایا گیا ہے تاکہ تجربات کی نوعیت کو سمجھا جاسکے۔ فکشن میں تجربات جاری ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ سوال بھی ذہن میں اُبھرتا ہے کہ کیا صرف تکنیک سے کوئی فن پارہ اعلیٰ قدر و قیمت کا حامل بن سکتا ہے۔ ممتاز شیریں کی یہ رائے اہمیت کی حامل ہے کہ:

> ''گو تکنیک کسی فن پارے کے حسن کا ایک نہایت ضروری جزو ہے، لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ محض تکنیک ہی کسی فن کو اچھا بنا سکتی ہے۔ جب تک مواد اسلوب اور تکنیک میں ہم آہنگی نہیں ہوتی افسانہ فن پارہ نہیں بنتا... تکنیک کی جدت جاذبِ نظر ضرور ہوتی ہے لیکن اگر مواد معمولی ہو اور افسانہ صرف تکنیک کی خاطر لکھا جائے تو بے اثر ہو جاتا ہے۔''(۲۵)

اردو کے افسانوی ادب میں تکنیک کے تنوع نے افسانے میں ابلاغ اور کہانی پن کا مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ ڈاکٹر انتظار حسین نے ''بستی'' میں ہیت کا تجربہ کیا۔ انھوں نے علامتی و استعاراتی نظام کے تحت اپنے ناسٹیلجیا کو بیان کیا۔ اس میں کہانی پن موجود ہے۔ اگرچہ مشکل ہی سے سہی مگر ابلاغ ہو جاتا ہے۔ انیس ناگی نے ''دیوار کے پیچھے'' میں جو تکنیکی تجربہ کیا ہے، اسے روایت سے بغاوت کے باوجود ایک کامیاب تجربہ قرار دیا جاسکتا ہے کیوں کہ یہاں روایت کی تشکیل تو ہے، انہدام نہیں ہے۔ انور سجاد کے ناول ''خوشیوں کا باغ'' بھی ایسے ہی تجربے کا حامل ہے لیکن ابلاغ اور کہانی پن کی کمی نے اسے صرف ایک تجرباتی ناول بنا دیا ہے۔ اس ناول میں انور سجاد نے مونتاژ کی جدید تکنیک سے کام لیا ہے۔ اُن کے اس اسلوب سے ناول میں مطالعے کی چاشنی میں کمی واقع ہوتی ہے اور قاری اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے۔ اسے کسی حد تک ناول کہا جاسکتا ہے۔ لیکن تجرباتی دنیا میں روایت کے انہدام کا بے درد مظاہرہ فہیم اعظمی کے ناول ''جنم کنڈلی'' میں نظر آتا ہے جو کہ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ یہ ایک انوکھا اور ناکام تجربہ ہے۔ اس میں نہ تو ابلاغ موجود ہے اور نہ کہانی پن ڈاکٹر ممتاز احمد خان کی رائے میں آزاد تلازمۂ خیال، شعور کی رو اور مونتاژ کی تکنیکوں نے اس ناول کو قاری کے لیے پریشان کن بنا دیا ہے کیوں کہ اس ناول کو کہیں سے بھی پڑھنا شروع کریں قصے پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لیے اس پر اینٹی ناول کا گمان صحیح معلوم ہوتا ہے۔(۲۶)

یہاں اس بات کا اعادہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ محض تکنیک سے فن پارہ وجود میں نہیں آجاتا۔ تکنیک کے ساتھ ابلاغ اور کہانی پن افسانے کی بنیادی ضروریات میں سے ہیں۔ انسان کی ذہنی کیفیات مختلف ہوتی ہیں اور ان کے اظہار کے لیے مختلف پیرایوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر انھیں بالکل مانوس اور اجنبی نہیں ہونا چاہیے۔ جدید افسانوی ادب میں عدم ابلاغ اور عدم ماجرائیت تشویش ناک حد تک بڑھ جانے سے قاری اور ادیب کے رشتے میں دراڑیں پڑ سکتی ہیں۔ ادیبوں کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ اپنے تجربات صرف

اپنی حد تک محدود رکھنے کے بجائے قاری کے ذہن تک منتقل کرنے کے لیے افسانوں میں ابلاغ اور کہانی پن کو برقرار رکھنا ہوگا۔ احمد ہمیش نے اپنے ایک مضمون میں قصے کے ابلاغ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستانی کہانی کاروں کو اب شدت سے قاری کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔(۲۷) خدا کرے واقعی ایسا ہو کیوں کہ آزاد مہدی کے ناول ''میرے لوگ'' نے ایک بار پھر تشویش کو ہوا دی ہے۔ اگرچہ بعد میں ''دلال'' میں وہ ایک کچھ سنبھلے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن خوف تو اپنی جگہ بجا ہے۔ آخر میں اقتباس کی طوالت کی پیشگی معذرت کے ساتھ ''صالحہ عابدہ حسین کے یہ الفاظ جوں کے توں نقل کرنا چاہوں گا جو اب تک کی بحث کا خلاصہ اور میری نظر میں سونے کے پانی سے تحریر کرنے کے قابل ہیں۔

''کوئی بھی فنکار یہ نہیں چاہتا کہ اس کے لکھے کو پڑھنے والے سمجھ کر نہ پڑھیں اور پڑھ کر نہ سمجھیں۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے فن کو سمجھا جائے اور قدر کی جائے اور یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ چاہے انداز، اسٹائل، طریقہ نیا ہو مگر بات کہنے کا انداز ایسا ہو کہ قاری سمجھ سجائے... مصنف نقاد، ادیب، شاعر جو بھی ہیں۔ آپ کو اچھی طرح جاننا چاہیے کہ غلط سلط زبان، اکھڑا اکھڑا انداز، عجیب و غریب تشبیہ و استعارے نرالی نرالی اصطلاحیں اور اشارے کسی بھی نثر کو، خاص کر کہانی کو بوجھل اور بے معنی تو بنا سکتے ہیں دلکش اور دل چھونے والی نہیں اور کہانی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ فن کار کے دماغ سے نکلے اور قاری کے دل میں اُتر جائے کہ کہانی ملکوں کو نہیں دلوں کو فتح کرتی ہے۔ یہی اس کا مقصد ہے، اس کی کامیابی اور اس کی معراج ہے۔''(۲۸)

حواشی:

(۱) گوپی چند نارنگ: مرتب، اردو افسانہ روایت اور مسائل، مضمون شاعری اور فکشن کی ٹوٹتی حد بندیاں، بلراج کومل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۴ء، ص ۲۲۷

(۲) ایضاً مضمون افسانے میں کہانی پن کا مسئلہ، از شمس الرحمٰن فاروقی، ص ۷۰۰

(۳) کلیم الدین احمد، پروفیسر: اردو زبان اور فن داستان گوئی، نیشنل بک فاؤنڈیشن ۱۹۹۰ء، ص ۶

(۴) ایضاً، ص ۹

(۵) ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، مرتب کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۱۹۲

(۶) سلیم اختر، ڈاکٹر: اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۲۰۹۔۲۱۰

(۷) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: اردو افسانہ اور افسانہ نگار، الوقار پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۰ء، ص ۱۴

(۸) ایضاً

(۹) ممتاز شیریں، معیارِ تنقید، نیا ادارہ، لاہور، سن ندارد، ص ۶

(۱۰) آزادی کے بعد اردو ناول، ص ۱۰۴۔۱۰۵
(۱۱) ایضاً، ص ۱۸۶۔۱۸۷
(۱۲) ایضاً، ص ۱۷۸
(۱۳) ممتاز احمد خان، ڈاکٹر: اردو ناول کے بدلتے تناظر، ویلکم بک پورٹ، کراچی ۱۹۹۳ء، ص ۱۶۸
(۱۴) معیار، ص ۱۷
(۱۵) ایضاً، ص
(۱۶) ایضاً، ص ۲۹
(۱۷) اردو افسانہ روایت اور مسائل، مضمون، ناول اور افسانے میں تکنیک کا تنوع، از ممتاز شیریں، ص ۵۶۔۵۷
(۱۸) ایضاً، مضمون، تخلیقی افسانہ کا فن، از محمود ہاشمی
(۱۹) ایضاً، مضمون اردو میں علامت نگاری، از گوپی چند نارنگ، ص ۵۰۱
(۲۰) ایضاً، مضمون ناول اور افسانے میں تکنیک کا تنوع، ص ۵۷، اردو افسانے پر مغرب کا اثر، از ممتاز شیریں، ص ۱۰۳
(۲۱) کشافِ اصطلاحاتِ تنقید، ص ۲۰۸۔۲۰۹
(۲۲) ایضاً، ص ۲۰۹
(۲۳) اردو ناول کے بدلتے تناظر، ص ۳۰۴
(۲۴) اردو افسانہ روایت اور مسائل، مضمون اردو افسانے پر مغرب کا اثر، ص ۹۱۔۹۲ اور معیار از ممتاز شریں، ص ۶۶
(۲۵) معیار، ص ۵۷
(۲۶) آزادی کے بعد اردو ناول، ص ۱۹۶۔۱۹۷
(۲۷) اردو افسانہ روایت اور مسائل مضمون 'پاکستان میں ۷۰ کے بعد نئی اردو کہانی' از احمد ہمیش، ص ۵۳۴
(۲۸) گوپی چند نارنگ، مرتب، نیا اردو افسانہ، انتخاب، تجزیے اور مباحث، مضمون 'کہانی کی کہانی' از صالحہ عابدہ حسین اردو اکادمی، دلی ۲۰۰۳ء، ص ۲۳۔۲۴

تعلیقات:

☆ حکایت ایسی مختصر منظوم یا منثور کہانی کو کہتے ہیں جو فرضی کرداروں اور فرضی واقعات کی مدد سے انسانی رہنمائی کے لیے کوئی اصول پیش کرے۔ حکایت کے کردار، انسان، حیوان، فرشتے، بے جان اشیاء بھی ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ اس کا اصل مقصد بصیرت عطا کرنا ہے جو ان کرداروں کے عمل اور واقعات سے پیدا ہوتی ہے، لطیفے کی طرح معیاری حکایت کے آخر میں بھی کوئی شوخ سا جملہ ہوتا ہے جو حکایت کے پلاٹ کا نقطۂ عروج ہوتا ہے۔ وہ دانش جو حکایت کا مقصود ہوتی ہے، اسی حصے میں مخفی ہوتی ہے۔ کشافِ اصطلاحات تنقید، (۷۰)

☆ تمثیل کی اصلاح (Allegory) کے لیے استعمال ہوتی ہے اور بسا اوقات ایسی کہانی کو جو کسی اخلاقی سبق کی تدریس و تلقین کے لیے تمثیلاً کہی جائے تمثیل کہہ دیا جاتا ہے۔ جیسے مولانا روم کی تمثیلیں، منطق میں تمثیل Analogy کے اصطلاحی معنی میں ہے۔ دو چیزوں کی بعض مشابہتوں کو دیکھ کر یہ قیاسی نتیجہ اخذ کرنا کہ چونکہ یہ دو چیزیں فلاں یا فلاں فلاں باتوں میں ایک دوسرے سے مماثل ہیں اس لیے یہ فلاں بات میں بھی ایک دوسرے سے مماثل ہوں گی۔ انتہائی قرینِ قیاس تمثیل بھی گمانِ غالب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اسے قطعی دلیل کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ کشافِ اصطلاحاتِ

تنقید، ص ۴۹

تمثیل میں بے جان اشیا کو جاندار بنا کر پیش کیا جاتا ہے اردو میں ''سب رس'' کی تمثیل اخلاقی درس کے لیے تحریر کی گئی۔ راقم الحروف۔

پکارسک کی آکسفورڈ ڈکشنری میں مندرجہ ذیل تعریف دی گئی ہے۔

"Picarcsue is a style or type of literature describing the adventures of a person who is rather rough and dishonest."

Oxford Advanced Learner Dictionary

رسوائے امراؤ جان ادا میں اسے یوں بیان کیا ہے۔

کس کو سنائیں حالِ دل زار اے ادا
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

مونتاژ کے بارے میں آکسفورڈ ڈکشنری کی تعریف یہ ہے:

"Montage is a picture yilm, or piece of music or writing composed of many separate items put together in an intersting and unusual combination."

Oxford Advanced Learner Dictionary

یعنی،

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا
بھان متی نے کنبہ جوڑا

کتابیات:

(۱) ابوالاعجاز حفیظ صدیقی: مرتب کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۵ء۔

(۲) سلیم اختر، ڈاکٹر: اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۱ء

(۳) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: اردو افسانہ اور افسانہ نگار، الوقار پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۰ء

(۴) کلیم الدین احمد، پروفیسر: اردو زبان اور فنِ داستان گوئی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۰ء

(۵) گوپی چند نارنگ: مرتب اردو افسانہ، انتخاب، تجزیے، مباحث، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۳ء

(۶) گوپی چند نارنگ: مرتب اردو افسانہ روایت اور مسائل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۴ء

(۷) ممتاز احمد خان، ڈاکٹر: آزادی کے بعد اردو ناول، انجمن ترقی اردو، کراچی ۱۹۹۷ء

(۸) ممتاز احمد خان، ڈاکٹر: اردو ناول کے بدلتے تناظر، ویلکم بک پورٹ، کراچی ۱۹۹۳ء

(۹) ممتاز شیریں، معیارِ تنقید، نیا ادارہ، لاہور، سن ندارد۔

(10) Oxford Advance Learner's dictionary, Oxford university press, 5th Edition 1998.

پروفیسر افتخار اجمل شاہین☆

ڈاکٹر عندلیب شادانی کی غزل گوئی

غزل اردو شاعری کی آبرو ہے اور ڈاکٹر عندلیب شادانی سابق مشرقی پاکستان کی اردو غزل کی آبرو تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا وہ مشرقی پاکستان کے شعروادب کی آبرو تھے۔ ان کی ذات ایک انجمن کی حیثیت رکھتی تھی۔ انھیں کے دم سے وہاں کے شعروادب کی محفلوں میں رونق اور زندگی تھی۔ وہ دبستان ڈھاکا کے منفرد، ممتاز اور مقبول ترین شاعر تھے۔ وہ اس سرزمین کے شعروادب کے نمائندے تھے۔ وہ ۱۹۲۸ء میں ہی ڈھاکا آ گئے تھے اور ڈھاکا یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک ہو گئے تھے۔ وہ ۱۹۶۹ء تک یعنی اپنے انتقال کے وقت تک اردو زبان وادب کی خدمت کرتے رہے۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی بڑی جامع شخصیت کے مالک تھے وہ بیک وقت شاعر، افسانہ نگار (سچی کہانیوں کے موجد) نقاد، محقق، مورخ مدیر اور ایک کامیاب اور مقبول معلم کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ ان کا مجموعہ کلام ''نشاط رفتہ'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ دوسرا مجموعہ بھی ترتیب دے چکے تھے جس کا نام ''نشاط رفتہ کے بعد'' رکھا تھا مگر وہ اشاعت پذیر نہ ہو سکا۔ اب پتہ نہیں وہ مسودہ کس کے پاس ہے اگر وہ مجموعہ بھی شائع ہو جاتا تو اچھا ہوتا۔ نشاط رفتہ میں ان کی نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ مگر عندلیب شادانی کا غالب رجحان غزل گوئی ہی کی طرف تھا اس لیے پروفیسر نظیر صدیقی نے کہا تھا ''موضوع ماحول اور فضا کے اعتبار سے دونوں ایک ہی نوع کی چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ اور وہ ایک کامیاب اور مقبول غزل گو کی ہی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں، یا یہ کہنا بہتر ہوگا کہ ان کی غزلیں ہی ان کی وجہِ شہرت ہے۔ وہ جس خوبی اور کامیابی کے ساتھ غزلیں کہتے تھے وہ بات دیگر اصناف سخن میں نظر نہیں آتی۔ شادانی صاحب نے نظمیں بھی کہیں ہیں بلکہ آزاد نظمیں بھی کہیں مگر ان کی تمام تر اور مقبولیت کا راز ان کی غزل گوئی ہی میں ...ہے۔

وہ بلاشبہ مشرقی پاکستان ہی کے نہیں بلکہ اپنے دور کے ایک اہم اور مقبول ترین شاعر تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی شاعری کا آغاز نظم گوئی سے ہوا مگر وہ غزل گو کی حیثیت سے ہی زیادہ کامیاب ہوئے۔ ان کے دلی جذبات واحساسات قلبی

☆G-09، صائمہ کلاسیک، گلشن اقبال، کراچی

واردات غزل کے مزاج سے ہم آہنگ تھے وہ طبعاً غزل کی طرف مائل تھے یعنی وہ غزل کے لیے تھے اور غزل ان کے لیے۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی کا تعلق انھی غزل گو شعرا سے ہے جن پر لوگ روایت پرستی کا الزام بھی لگاتے ہیں حالاں کہ یہ بات درست نہیں بلکہ میں اسے ایک سطحی بات سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ غزل روایتی ہو یا جدید اگر اس میں تغزل نہ ہو تو ایسی غزل قابل توجہ نہیں ہوتی۔ جہاں تک عندلیب شادانی کا تعلق ہے انھوں نے اردو غزل کو ایسا حسن اور رنگ بخشا جن کی چمک دمک آج بھی قائم ہے اسی لیے آج بھی لوگوں کو ان کے درجنوں اشعار یاد ہیں اور ان کو موقع کے لحاظ سے سناتے بھی ہیں۔ شادانی صاحب کا شمار ان شاعروں میں ہونا چاہیے جنھوں نے اردو غزل کو زندہ رکھا تھا۔ یعنی اسے نئی زندگی دی ہے اور اسے پروان چڑھایا ہے۔ عندلیب شادانی نے اردو غزل میں معاملات حسن و عشق اور رومان کے یذکرے نئے انداز نئے لب و لہجے میں اور نئے رنگ سے چھیڑے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی شاعری میں نفسیاتی رموز اور نکات اس خوبصورتی سے پیش کیے ہیں جس کی وجہ سے ان کو اردو غزل گویوں میں منفرد مقام ملا اور انھوں نے غزل گو کی حیثیت سے بے پناہ شہرت حاصل کی۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی نے انسانی فطرت کا بڑا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ کیا تھا۔ ان کے مشاہدے اور تجربے میں جو باتیں آئیں ان کو نہایت موثر اور دلنشیں انداز میں اپنے اشعار میں پیش کر دیا وہ ایک زبردست نباض فطرت تھے۔ مندرجہ ذیل اشعار کے مطالعے سے اس حقیقت کا ثبوت مل جائے گا۔ ان اشعار میں نفسیاتی رموز اور حقائق کی نہایت روشن اور عمدہ مثالیں ملتی ہیں:

بے نیازانہ برابر سے گزرنے والے
تیز کچھ قلب کی رفتار ہوئی تھی کہ نہیں

خود سوچتا ہوں کہ میں یہ کیا ہو گیا مجھے
وعدہ نہیں کسی کا مگر انتظار ہے

دوستو! تم پہ بھی گزرا ہے کبھی یہ عالم
نیند آتی نہیں اور خواب نظر آتے ہیں

دل سے اک دھواں اٹھا آنکھ ڈبڈا آئی
انتظار کی آخر کوئی انتہا بھی ہے

نہ سن میری محرومیوں کا فسانہ
تجھے ضبط غم اور دشوار ہوگا

تم تو ہمیں کو کہتے تھے یہ تم کو کیا ہوا
دیکھو کنول کے پھولوں سے شبنم چھلک نہ جائے

میں اس کو بھولا ہی کب تھا نفس کا یہ بھی دھوکا تھا
سچ مچ جس کو بھول گئے ہوں کیا وہ یونہی یاد آتا ہے

دل جدھر جھکا جھکا اور جدھر رکا رکا کوئی بے وفا نہیں کوئی باوفا نہیں

اس آخری شعر کی تشریح شادانی صاحب نے خود راقم الحروف کی تھی۔ انھوں نے ایک نفسیات کی کتاب کا حوالہ دیا جس کا مطالعہ انھوں نے ان دنوں کیا تھا انھوں نے کہا کہ یہ انسان کی عادت اور اس کی فطرت ہے کہ کبھی وہ کسی کے قریب آجاتا ہے پھر کسی دوسرے کے قریب یعنی جیسے جیسے ملاقات ہوتی جاتی ہے تعلقات قائم ہوتے چلے جاتے ہیں اس طرح بعض پرانے ملنے والوں کے یہاں آنا جانا کم ہو جاتا ہے اور نئے لوگوں کے یہاں آنا جانا بڑھ جاتا ہے۔ ایسا غیر شعوری طور پر ہوتا ہے اس نے کسی کو بھی موردِ الزام قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ایمائیت، اشاریت، اختصار اور اجمال اور تغزل غزل کی بنیادی خصوصیات ہیں اور شادانی صاحب نے ان خصوصیات کو اپنی شاعری میں بدرجہ اتم برتا ہے۔ تغزل کی چند مثالیں دیکھیے:

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں انھیں کی یاد میری زندگی ہے

مجھے بھول جانے والے مجھے یاد آنے والے تجھے اپنی خلوتوں کا کوئی یاد ہے فسانہ

تم دور تھے نظر سے اور چاندنی کھلی تھی آنکھوں سے رات پیہم ٹوٹا کیے ستارے

سنا ہو تم نے شاید میرے ہمسایوں میں چرچا ہے کہ اکثر رات کو رونے کی اک آواز آتی ہے

اڑی بازوؤں سے میرے جو شمیم مشک و عنبر کئی دوست کچھ نہ سمجھے کئی دوست مسکرائے

ڈاکٹر شادانی صاحب نے آخری مصرعہ پہلے اس طرح کہا تھا جسے بعد میں بدل دیا۔ یعنی اڑی بازوؤں سے میرے جو بھینی بھینی خوشبو۔

حسن محو خواب تھا شب یا مرے آغوش میں
بوستاں پھر پھول تھے اور آسماں بھر چاندنی

اس آخری شعر کے بارے میں پروفیسر نظیر صدیقی کہتے ہیں:

میرا خیال ہے کہ آخری شعر کے دوسرے مصرعے کا انداز بیان آنا نادر ہے کہ اس کی مثال اردو شاعری میں شاید ہی کہیں مل سکے۔

ڈاکٹر شادانی کے اشعار میں تشبیہات اور استعارات کا بہت خوبصورت، دلنشیں اور پراثر انداز ملتا ہے۔ ان کے استعاروں تشبیہات میں تازگی بھی ہے اور جدت بھی، چند اشعار دیکھیے:

تم دور تھے نظر سے اور چاندنی کھلی تھی — آنکھوں سے رات پیہم ٹوٹا کیے ستارے

کشش بدر سے چڑھتا ہوا دریا دیکھا — اللہ اللہ وہ عالم تری انگڑائی کا

تارے سے شفق میں چھلکے تھے شبنم میں پھول نہایا تھا — وہ کتنا دلکش منظر تھا جب تم کو پسینہ آیا تھا۔

آنسو جو ہوئے خشک تو جلنے لگیں آنکھیں — گہوارۂ شبنم میں شرر دیکھ رہا ہوں

ڈاکٹر شادانی کی غزلوں میں خلوص اور جذبے کی صداقت کا بھرپور اظہار پایا جاتا ہے۔ انھوں نے ایک بار خود مجھ سے کہا تھا کہ میرے ہر شعر کا پس منظر صداقت ہے، ہر شعر سچا ہے گویا ان کے اشعار حسن صداقت ہے اور صداقت حسن (Beauty is truth, truth is beauty keats) کی تصویر نظر آتی ہے دوسری بات یہ ہے کہ شادانی صاحب کو قدرت نے ذوق جمالیات (Aestheic sense) سے نوازا تھا۔ نظیر صدیقی کہتے ہیں:

''شادانی صاحب کی محبت مجازی ہے ماورائی نہیں۔ پھر بھی ان کے عشق یا عشقیہ شاعری میں جتنی پاکیزگی، جتنی معصومیت اور جتنی طہارت ہے اتنی اوروں کے یہاں مشکل ہی سے نظر آئے گی۔''

مجھے تو اس سلسلے میں شادانی صاحب، مومن اور حسرت موہانی کسی حد تک قریب تر نظر آتے ہیں۔ اگر عشقیہ جذبات اور معاملات حسن و عشق کے حقائق کو اگر شاعرانہ انداز میں اور دلنشیں پیرائے میں پیش کیا جائے تو اشعار میں حسن پیدا ہو جاتا ہے جذبات کی صداقت نے ان کے اشعار میں زبردست حسن اور تاثر پیدا کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ شادانی صاحب کے بہت سے اشعار پڑھنے والوں اور سننے والوں کو متاثر کرتے ہیں۔ اچھے شعر میں یہ بھی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ترسیل کرتا ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کے اشعار نہ صرف پاکستان میں بطور حوالہ پیش کیے جاتے ہیں بلکہ ہندوستان اور دیگر ممالک میں ان کی شاعری کا چرچا ہوتا ہے۔ آخر میں چند اشعار بطور حوالہ پیش کرنا چاہوں گا۔ ایسے کچھ اشعار کا ذکر اوپر بھی آچکا ہے اس قبیل کے کچھ اور اشعار دیکھیے:

عشق سے ہوتا ہے آغاز حیات — اس سے پہلے زندگی الزام ہے

وہ الم کشوں کا ملنا وہ نشاط و غم کے سائے — کہیں رو پڑا تبسم کہیں اشک مسکرائے

تم جبر محبت کیا جانو اچھا یہ بتاؤ تم نے کبھی — ہنسی ہوئی آنکھوں کے پیچھے اشکوں کا سمندر دیکھا ہے

نہیں جو لطف مسلسل دلِ حزیں میں نہ تڑپ
تمام رات کہیں چاندنی نہیں ہوتی

غم جو رخصت ہوئے خوشی بھی گئی
چاند کے ساتھ چاندنی بھی گئی

شوق کی رات ہے ناز کی رات ہے
اور تقدیر سے چاندنی رات ہے

اک پہیلی ہے بوجھو تو جانیں کہ ہاں
آج کیوں اس قدر سونی رات ہے

خود ہی گن لو مری عمر کی ساعتیں
آج تم سے ملے کون سی رات ہے

رو چکے آؤ ہنس بول لیں دو گھڑی
جو نہ آئے گی پھر یہ آخری رات ہے

میں تجھے بھول گیا ہائے تری سادہ دلی
کوئی طائر کبھی بھولا ہے نشیمن اپنا

دیر لگی آنے میں تم کو شکر ہے پھر بھی آئے تو
آس نے دل کا ساتھ نہ چھوڑا ویسے ہم گھبرائے تو

تصویر میں نے مانگی تھی شوخی تو دیکھیے
اک پھول اس نے بھیج دیا ہے گلاب کا

چوٹ پڑی ہے دل پر تو آہ لبوں تک آئی ہے
یوں ہی چھن سے بول اٹھنا تو شیشے کا دستور نہیں

غرضیکہ ایسے بہت سے اشعار ہیں جو قارئین کو دعوت مطالعہ دیتے ہیں مگر طوالت کے خوف سے ان کا درج کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان کی شاعری کی اور بھی دیگر اہم خصوصیات کے خوف سے ان کا درج کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان کے یہاں چاند کا بہت ذکر ہوا ہے اور اسی نے پروفیسر عطا کاکوی نے ان کو ماہتابی شاعر یا Poet of moon بھی کہا ہے المختصر میں یہ کہوں گا کہ شادانی صاحب اپنے دور کے ایک ممتاز غزل گو شاعر تھے اور آج بھی ان کی شاعری کو قدر منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

درخواست

۱۔ معزز قلمی معاونین سے درخواست ہے کہ وہ ہاتھ سے تحریر کردہ مضمون کے بجائے اگر کمپوز کرا کے ارسال کریں تو بہتر ہے۔

۲۔ تبصرے کے لیے دو کتابیں بھیجنا لازمی ہیں تا کہ ایک مبصر کو دی جا سکے اور دوسری انجمن کے قدیم کتب خانے میں محفوظ کرائی جا سکے، جہاں عام قارئین اور محققین برائے مطالعہ تشریف لاتے ہیں۔

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی☆

ترکی میں اُردو

بریگیڈیر صدیق سالک نے اپنے کسی سفرنامے میں لکھا تھا کہ ایک مرتبہ وہ پاکستان سے ترکی جانے والے ایک فوجی وفد میں شامل تھے۔ وہاں قیام کے دوران ایک روز میزبانوں نے مطلع کیا کہ کل آپ لوگوں کو اردو اکیڈمی کا دورہ کرایا جائے گا۔ وفد کے دوسرے ارکان کے دل تو یہ سن کر بجھ گئے (بھلا اردو اکیڈمی میں فوجیوں کی کیا دلچسپی؟) لیکن سالک صاحب اپنے ادبی پس منظر کے باعث خوشی کے مارے رات بھر سو نہ سکے اور ان سوالات کی تیاری کرتے رہے جو وہ اکیڈمی کے ذمے داران سے ترکی میں اردو کے موضوع پر پوچھتے۔

دوسرے دن وفد کو گاڑی میں بٹھا کر اکیڈمی لے جایا گیا۔ ساتھ جانے والے ترک گائڈ نے جب دور سے ''اردو اکیڈمی'' کی نشاندہی کی تو بریگیڈیر صاحب اس وسیع و عریض اور پرشکوہ عمارت کو دیکھ کر دنگ رہ گئے کیوں کہ ہمارے یہاں صوبائی دارالحکومتوں میں اکادمی ادبیات، رائٹرز گلڈ، مقتدرہ قومی زبان اور انجمن ترقی اردو وغیرہ کے علاقائی دفاتر پر ناصر کاظمی کا یہ مصرع صادق آتا ہے کہ:

اداسی بال کھولے سو رہی ہے

آخرکار پاکستانی وفد جب ''اردو اکیڈمی'' کے مین گیٹ پر پہنچا تو دو باوردی افسران نے اسے سیلوٹ کیا۔ اس وقت یہ عقدہ کھلا کہ وہ دراصل ترکی کی ملٹری اکیڈمی تھی۔

اہلِ علم جانتے ہیں کہ اردو، ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی فوج کے ہیں۔ اسی لیے ہم نے اپنے حالیہ دورۂ ترکی میں دیکھا کہ وہاں کے عام باشندے (جن میں اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی شامل ہیں) اردو زبان کو (غالباً فوج سے ممتاز کرنے کی خاطر) ''اُردی'' کہتے ہیں۔ بہرحال ہمارے سامنے جس نے بھی ہماری قومی زبان کی یوں بے دریغ دوہری تصغیر کی، ہم نے جھٹ اپنا قومی فریضہ ادا کرتے ہوئے اسے ٹوکا ''بھائی صاحب، اردو کہیے، اردو!''

یہ بات کوچہ و بازار کی تھی۔ جب ہم استنبول یونی ورسٹی کے شعبۂ ادبیات کے پروفیسر (ڈاکٹر) دُرمُش بُلگُر (Durmus

☆ 39/1، صدیق ہاؤس، خیابانِ سحر، فیز VI، ڈیفینس ہاؤسنگ اتھارٹی DHA، کراچی 75500

(Bulgur سے ملے تو ان کی زبان سے اپنی زبان کی قدر و منزلت سن کر ہمارا سیروں خون بڑھ گیا۔ پروفیسر صاحب نے بتایا کہ ان کے شعبے میں عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ بی اے (آنرز) کی سطح کا چار سالہ کورس ہوتا ہے اور فی الحال ایک سو طالب علم اردو پڑھ رہے ہیں۔ بی اے (آنرز) کے بعد ایم اے اور پھر پی ایچ ڈی کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ اس وقت ایک طالب علم اور ایک طالبہ ان کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی تیاری کر رہے ہیں۔ طالب علم کے مقالے کا موضوع ہے ''اردو نثر میں ترک اور ترکی'' جب کہ طالبہ ''اردو شاعری میں ترک اور ترکی'' کے موضوع پر مقالہ لکھ رہی ہے۔ ہم نے پروفیسر صاحب سے دریافت کیا کہ اردو کی تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے روزگار کے کیا مواقع ہیں؟ تو ان کا جواب تھا ''لسانیات میں دلچسپی رکھنے والے اردو کو اپنے علم میں اضافے اور اس کے وسیع ادب تک رسائی کی غرض سے پڑھتے ہیں۔ جہاں تک روزگار کا تعلق ہے ہمیں اپنے شعبے کے لیے اساتذہ مل جاتے ہیں۔'' اس پر ہمیں یوسفی صاحب یاد آ گئے۔ ''زرگزشت'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں ''فلسفہ پڑھ کے آدمی صرف ایک کام کر سکتا ہے، دوسروں کو فلسفہ پڑھا سکتا ہے۔''

پروفیسر دُرمُش ہم سے نہایت شستہ لہجے میں گفتگو کر رہے تھے اور آدھے گھنٹے کی ملاقات میں کہیں بھی یہ اندازہ نہیں ہوا کہ اردو ان کی مادری زبان نہیں۔ انھوں نے بتایا کہ انقرہ یونی ورسٹی میں بھی اردو پڑھائی جاتی ہے۔ افسوس، ہم وہاں نہ جا سکے کیوں کہ اسی اثنا میں تعلیمی اداروں میں گرمی کی تعطیلات شروع ہو چکی تھیں۔ پروفیسر صاحب کے مطابق اردو زبان میں ترکی کے لگ بھگ تین ہزار الفاظ اپنے اصل معانی کے ساتھ شامل ہیں۔ چند الفاظ ہم نے نوٹ کیے یعنی ۔یعنی، تنہا، بازار، چھت، دادا، آزاد، ہوا، نان، کباب، کوفتے، قورمہ، عصمت، گل، صاحب (مالک)، انسان، شاعر، باران (بارش)، برف، خبر، نظر، طاقت، شال، حمام، مشہور، صدقہ، بابا، شلوار، شفق، حرب، عرفان، صحبت، رحل، کشکول، پریشان، قربان، دنیا، سیاحت، شان، مرکز، قوت، ہلال ترجمان، ماضی، استقبال وغیرہ۔ ہمارے قومی ترانے میں موخرالذکر سات الفاظ (شان، مرکز، قوت، ہلال، ترجمان، ماضی اور استقبال) ترکی کے ہیں۔

بعض الفاظ جو اردو میں رائج ہیں ان کا تلفظ وہاں مختلف ہے مثلاً کرسی کو ''چُرسی'' کہا جاتا ہے کیوں کہ وہ لوگ ''ک'' کا تلفظ ''چ'' سے مشابہ کرتے ہیں۔ اسی طرح ''چوں کہ'' وہاں ''چُوں چہ'' ہے۔ ہم نے ایک روز اپنے گائڈ سے کہا کہ سورہ کوثر تو پڑھے۔ اس نے شروع کیا ''انا اعطینا چل چوثر...'' ہم نے کہا ''بس بس۔'' بعض الفاظ کے وہاں معانی مختلف ہیں مثلاً شیریں حسین، سبزہ سبزی (ترکاری) اور سچ سر کے معنوں میں مستعمل ہیں۔ ترکی زبان میں ''خ'' نہیں ہے اس لیے اس کا تلفظ ''ح'' جیسا ہوتا ہے۔ ماضی کی ایک نامور ترکی مصنفہ جنھیں ہم خالدہ ادیب خانم کے نام سے جانتے ہیں وہاں حالدہ ادیب حانم کہلاتی ہیں۔

ترکی کے ایک اور شہر قونیہ میں (جو عظیم صوفی شاعر مولانا رومیؒ کی آخری آرام گاہ کے باعث چار دانگِ عالم میں مشہور ہے) ہماری ملاقات وہاں کے گورنر اور ان کی بیگم سے ہوئی۔ گورنر صاحب کا نام آئیڈین نیزخ دوجن (Aydin Nezih

(Dogan تھا۔ ترکی کے لوگ پاکستان اور ان کے عوام سے کتنی محبت رتے ہیں اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ معزز جوڑے نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ہم ور ہماری بیگم سے کچھ دیر بات چیت کی اور بعدازاں تصویریں بھی کھنچوائیں۔ گورنر صاحب نے بتایا کہ وہ ایک بار کراچی آچکے ہیں۔ اہلِ پاکستان کے لیے انھوں نے خیرسگالی کے جذبات کا اظہار کیا جب کہ ایسے ہی جذبات کا اظہار ہم نے اہل ترکی کے لیے کیا۔ جب ہم نے گورنر صاحب کے سیکریٹری سے بیگم صاحبہ کا نام پوچھا تو انھوں نے لکھوایا Hatice Dogan ہم نے کہا ''ہَیٹِس دوجن؟'' انھوں نے تصحیح کی ''نہیں ہتیسے'' ہم نے حیرت ظاہر کی ''یہ کیا نام ہوا؟'' انھوں نے قدرے تعجب سے انگریزی میں سوال کیا، ''آپ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی شریکِ حیات کا نام نہیں جانتے؟'' ہم نے جواب دیا، ''کیوں نہیں، خدیجہ۔'' بولے، ''وہی ہتیسے۔''

کسی عورت کی تکریم مقصود ہو تو ترک لوگ اس کے نام کے بعد ''حاتون'' یا ''حانم'' کا اضافہ کرتے ہیں اور اگر کسی مرد کی تعظیم کرنی ہو تو اس کے نام کے ساتھ ''بے'' کا لاحقہ لگاتے ہیں۔ چناں چہ ایک ٹی وی ڈرامے میں ہم نے دیکھا کہ گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے افراد کرسیٔ عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہے تھے ''حاکم بے!'' یعنی ''جج صاحب!'' اب ذرا معانی کی تبدیلی پر غور فرمایئے۔ ہمارے خطّے میں کسی کی ہمت ہے کہ عدالت میں کہے ''جج بے!'' گویا جو لفظ وہاں کلمہ توقیر ہے، یہاں وہی لفظ کلمہ تحقیر ہے کہ کسی کی زبان سے ادا ہو جائے تو فوراً ''اندر'' ہو جائے۔

آخر میں چند باتیں پروفیسر دُرمُش بُلگُر کے حوالے سے۔ انھوں نے قونیہ اور انقرہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد استنبول یونی ورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ بعدازاں بہاؤالدین زکریا یونی ورسٹی (ملتان) کے پروفیسر (ڈاکٹر) اے۔ بی اشرف کی زیرنگرانی اردو میں پی ایچ ڈی کے مقالے کی تکمیل کی جس کا موضوع تھا ''برصغیر میں انیسویں صدی کی فکری تحریکیں'' اور اس مقصد کے لیے انھوں نے لاہور، ملتان، پشاور، دیوبند، علی گڑھ اور اعظم گڑھ کا سفر بھی کیا۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں قرآن حکیم کی تلاوت بھی (عموماً) لاطینی زبان میں چھپے ہوئے الفاظ کی مدد سے کی جاتی ہے پروفیسر دُرمُش سے اردو میں تفصیلی گفتگو کے بعد باہر نکلتے وقت ہم داغ کا یہ مصرع (تھوڑے سے تصرف کے ساتھ) زیرلب گنگنا رہے تھے: ''سارے جہاں'' میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔

ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان☆

محمد خالد اختر کا ناول: بیس سو گیارہ

''بیس سو گیارہ'' ممتاز مزاح نگار محمد خالد اختر کا اولین ناول ہے۔ انھوں نے تعارف میں اس ناول کو مستقبل کے متعلق ایک تفریحی فنتاسی قرار دیا ہے۔(۱) ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ یہ فنتاسی کے روپ میں ایک سیاسی اور معاشرتی طنز ہے۔(۲) انھوں نے فنتاسی نگار جارج آرویل اور ایچ جی ویلز کا تذکرہ بھی کیا ہے۔(۳) اور اپنے ناول کی انگریزی آمیز زبان کا جواز بھی پیش کیا ہے۔(۴) خالد اختر نے یہ اشارے کر کے تنقید کی بنیادیں فراہم کر دی ہیں۔ ان اشاروں نے اہلِ نقد کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کر دی ہیں اور ناول کی تفہیم اور تجزیے کے لیے انھیں شاید ان حدوں سے دور نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ذیل کے بحث میں بھی ان اشاروں سے مدد لی گئی ہے۔

''بیس سو گیارہ'' میں مستقبل کی دنیا کی ایک تصویر پیش کی گئی ہے مصنف نے ۲۰۱۱ میں دنیا کا ایک امکانی اور تصوراتی نقشہ کھینچا ہے۔ قاری یہ سوال اُٹھا سکتا ہے کہ خالد اختر نے ۱۹۹۲ء میں جس ہولناک تباہی کی نشاندہی کی تھی، وہ تو ۲۰۱۱ میں نہیں آئی — وہ قیامت جو گزرنی تھی، کہاں گزری ہے؟ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ ناول کا مصنف ایک تخلیق کار ہے نہ کہ برہمن۔ جب کہ ناول ''ایک فنتاسی ہے نہ کہ علم نجوم کی کتاب''(۵) یہ مصنف کی پیش بینی نہیں بلکہ اس کا ایک بھیانک خواب ہے جو اہل دنیا کی چشم کشائی کے لیے دیکھا گیا ہے۔ مستقبل میں اس خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے کا خطرہ بہر حال موجود ہے۔

''بیس سو گیارہ'' ایک فنتاسی ہے۔ یہ فنتاسی کیا ہے — فریب نظر ہے، خوابوں کی دنیا ہے اور توہم کا کارخانہ ہے۔ اس کی جامع تعریف یہ ہے کہ:

"A general term for any kind of fictional work that is not primarily devoted to realistic representation of the known world. The category includes several literary genres (e.g. dream vision, fable, fairy tale, romance, science fiction) describing imagined world in which magical powers and other impossibilties are accepted..."(6)

☆ شعبۂ اردو، نیشنل یونی ورسٹی آف ایجوکیشن، ٹاؤن شپ، لاہور

خالد اختر نے ناول میں فنتاسی کی تکنیک کو بروئے کار لانے کے لیے ''وقت اور مقام'' کو پیش نظر رکھا ہے۔ مقام، ماضنین ہے اور سال، بیس سو گیارہ۔ یہ سال اور یہ مقام، ایک امکان کو ظاہر کرتے ہیں۔ مصنف نے انھیں چشم تخیل سے دیکھا ہے۔ اس دنیا میں عجیب وغریب واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں جنھیں منطق کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جاسکتا اور ذہن کو ان واقعات کی تسلیم کے لیے ''مصنوعی یقین'' کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کیا موجودہ دنیا میں یہ ممکن ہے کہ ایک ملک کا صدر، دوسرے ملک میں پولیس سے چھپتا پھرے اور موچی بن کر گزر بسر کر رہا ہو؟ جہاں پہلوان، حکمرانوں کی خراب گاڑی کو دھکا لگاتے ہیں اور باری آنے پر حکمران یہ فریضہ انجام دیں جہاں ایسے انسان بھی ہوں جنھیں ''دونگی'' کہا جاتا ہو اور جو سواری کے طور پر استعمال ہوں اور جہاں کچھ انسان چوہوں کی طرح بلوں میں قیام پذیر ہوں لیکن فنتاسی میں یہ سب کچھ ممکن ہے اور ماضنین کی ریاست میں یہ تمام منظر ہماری نظروں سے گزرتے ہیں۔ یہ مناظر اور واقعات بہت دلچسپ اور پرلطف ہیں اور ایک عام قاری ناول سے فنتاسی کے طور پر بھی لطف اندوز ہوسکتا ہے لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ فنتاسی کی ایک سطح علامتی بھی ہوسکتی ہے۔ فنتاسی میں ''سب کچھ مذاق یا تفریح کی غرض سے نہیں آتا۔ اس کے پیچھے کوئی فلسفہ، کوئی تاریخ، کوئی اخلاقی دنیا یا طنز مزاح یا مستقبل کی دنیا کا خاکہ موجود ہوتا ہے۔''(۷) ''بیس سو گیارہ'' بظاہر ایک فنتاسی اور بباطن ایک طنز ہے۔ معاشرتی اور سیاسی۔ فہمیدہ ریاض کو تو اسے فنتاسی کہنے میں بھی تامل ہے۔ ان کا موقف ہے کہ اگر ''بیس سو گیارہ'' فنتاسی ہے تو پھر وطنِ عزیز کی حقیقت نگاری کیا ہے۔''(۸)

یہ درست ہے کہ اس ناول کی حد تک خالد اختر کے قلم میں ایک حقیقت نگار کی سی تلخی اور بے باکی ہے لیکن انھوں نے علامت اور استعارے کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ایک ذہین تخلیق کار کی طرح انھوں نے چیزوں کو یوں گڈمڈ کیا ہے اور قاری کو اتنے سلیقے سے ''گمراہ'' کیا ہے کہ وہ حتمی تیقن کے ساتھ کسی ایک جانب انگشت نمائی نہیں کرسکتا۔ جب وہ ماضنین کی داستان بیان کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنے ہی ملک کی کہانی سنائی جارہی ہے لیکن درمیان میں وہ کہیں ''اسلامستان'' کا ذکر کر دیتے ہیں۔ جو پاکستان، ایران اور افغانستان پر مشتمل ایک الگ (تصوراتی) بلاک ہے۔ یوں وہ اپنے قاری کی توجہ کو دوسری جانب منتقل کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ یہ ایک ادیب کا کمال ہے کہ وہ ''ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے'' کا مضمون باندھنے پر قادر ہو۔ خالد نے ماضنین میں ایک معروضیت اور عمومیت پیدا کر دی ہے۔ یہ معروضیت اور عمومیت مصنف کو بعض نازک اور حساس مقامات سے بہ سلامت گزرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے لیکن ناول کی کلی تفہیم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم کچھ دیر کے لیے ''موضوعیت'' کا دامن تھام لیں۔

''بیس سو گیارہ'' میں مصنف نے ایک فرضی ریاست ماضنین کا احوال بیان کیا ہے— نام سے ظاہر ہے کہ یہاں ماضی پرست لوگ رہتے ہیں— ''ماضنین کوئی بھی ریاست ہوسکتی ہے جس کا سفر مستقبل کی بجائے ماضی کی طرف جاری ہو۔''(۹) ماضنین کی سیاست، معاشرت اور مذہب کے حوالے سے مصنف نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کا بین السطور مطالعہ کیا جائے تو یہ ملکی حالات پر ایک طنز اور تنقید کا انداز لیے ہوئے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ناول قیامِ پاکستان کے چند برس بعد ہی تخلیق ہوا تھا اور مصنف یہاں ''یہ داغ

داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر'' کا ورد کرتا دکھائی دیتا ہے لیکن یہ ورد، درد سے خالی نہیں ہے۔ یہ ایک دردمند دل کی پکار بھی ہے۔ سید محمد کاظم نے اس صورت حال پر بہت عمدہ تبصرہ کیا ہے:

''... ہمارے اس نوزائیدہ ملک میں نیا نیا جمہوری راج تجربے کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ جمہوریت کی آزاد اور لاأبالی فضا نے حکومت اور سیاست سے لے کر ایک عام آدمی کی زندگی تک میں ایسے عجیب و غریب تضاد اور منافقانہ رویے کو جنم دیا تھا جس سے حساس طبیعتیں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتیں... حکومتوں کے پروٹوکول میں جو تکلفات، نمائش اور رکھ رکھاؤ ایک زمانے سے چلے آتے ہیں اور نئی جمہوری حکومتوں میں وزیروں کے رنگ ڈھنگ اور سوچنے اور کام کرنے کے جو انداز آج بھی ہر جگہ دیکھے جاسکتے ہیں، وہ سب ''۲۰۱۱'' کا موضوع ہیں۔ اس کے علاوہ اس ناول میں ایک خاص مذہبی ذہنیت، عورت اور پردے کے بارے میں عوام کا بے لچک رویہ، سیاسی پارٹیوں اور خصوصاً کمیونسٹوں کے کام کرنے کے ڈھنگ اور ادیبوں کی گروہ بندیاں اور ان کے باہمی تنازعات — اس وقت کی زندگی کے یہ سارے پہلو طنز و مزاح کے عمل کی زد میں آتے ہیں۔'' (۱۰)

حالات کچھ زیادہ تبدیل نہیں ہوئے۔ وہی ''ہے کہ جو تھا'' کا سماں ہے۔ خالد اختر نے نظامِ حکومت پر جو طنز کیے ہیں، ان کا اطلاق صرف اپنے ملک پر کیوں کریں، دنیا کے بہت سے دوسرے ملکوں کو بھی یہی حالات درپیش ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم حقیقت سے نظریں چرانے لگیں۔ خالد اختر نے ماضین کے مختلف ''وزرائے کرام'' — وزیرِ جھوٹ، وزیرِ جہالت، وزیرِ خوراک اور وزیرِ مالیات کے جو تعارف پیش کیے ہیں، ان میں سے اکثر سے ہم واقف ہیں۔ ذرا وزیرِ مالیات کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

''وہ ایک خوب صورت آدمی ہے، ستواں ناک اور حساس جاندنقوش۔ وزیرِ مالیات کی حیثیت سے وہ آسانی سے اپنی کابینہ میں خوف اور رعب سے دیکھا جاتا ہے کیوں کہ وہی ایک ایسا شخص ہے جو کابینہ میں مالیات جیسے ٹیڑھے مسئلے کو سمجھتا ہے۔ وہ سرپلس بجٹوں کا ماہر ہے اور اس کے سارے بجٹ سرپلس یا فاضل ہوتے ہیں۔ سرپلس بجٹ پیش کرنے کے بعد وہ دوسرے دن دوبارہ اسی بجٹ کو اسی خوبی سے پیش کرتا ہے کہ وہی بجٹ خسارے کا بجٹ بن جاتا ہے۔ مثلاً وہ سرپلس تقریر کے دوسرے روز بڑی معصومیت سے اُٹھ کر کہتا ہے: 'حضرات! کل جو بجٹ میں نے پیش کیا تھا اس میں تھوڑی سی میزان کی غلطی تھی۔ چار کروڑ روبل کی رقم سرپلس نہیں بلکہ خسارہ ہے۔ حضرات اس معمولی سے غلطی کو نوٹ کرلیں۔'' (۱۱)

وزیرِ جھوٹ کو اخبار ''شترابا ٹائمز'' کے ایڈیٹر مسٹر ایف ایل پٹاخا کا تعاون حاصل ہے:

وزیر جھوٹ اور پٹاخا کے اشتراک کا (یہ اشتراک صرف پالیسی میں ہے اور اس حد تک جب تک یہ دونوں آدمیوں کے ذاتی مفاد کے لیے مد ہو) یہ نتیجہ ہوا ہے کہ عوام اب اس بات کے جاننے کے لیے اتنے بے تاب نہیں رہے کہ ماضنین کے اندر کیا ہو رہا ہے جتنے اس بات کے ماضنین کے باہر کیا ہو رہا ہے۔ 'شترابا ٹائمز' کے اداریوں کی وجہ سے پہاڑی چوہوں کے خلاف ان کا صفرا ہمیشہ ابلتا رہتا ہے اور وہ اپنی ساری ناکامیوں، بھوک اور ننگ کی ذمے داری چوہوں کے سر تھوپتے ہیں۔ وہ فی الواقع یہ یقین کرنے لگ گئے ہیں کہ ان کے لیڈر نیک سادھومنش لوگ ہیں، جن کا دل دکھانا ملک کے ساتھ غداری ہے اور یہ بھی کہ ماضنین ایک جمہوریت ہے۔ ۰۰ ماضنین میں کہیں بھی دودھ اور شہد کی نہریں نہیں دیکھتے مگر جب پٹاخا جیسا عقل مند اور سب کچھ جاننے والا ان کو یقین دلاتا ہے کہ ایسی نہریں ان کے ملک میں بہتی ہیں اور یہ کہ اس نے خود بڑے کابو اور چھوٹے کابو (حکمرانوں) کو اپنے ہاتھوں میں کدالیں لے کر ایسی ایک نہر کھودتے دیکھا ہے تو ان کو یہ باور کرنا ہی پڑتا ہے...'' (۱۲)

''شترابا ٹائمز'' زرد صحافت کی علامت ہے۔ قومی صحافت کے چہرے پر نظر ڈالیں تو جبیں روشن سہی لیکن رخساروں کی زردی بھی نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ یہی حال مغربی ذرائع ابلاغ اور نشریاتی اداروں کا بھی ہے بلکہ وہاں تو یہ زردی تاب جبیں پھیلتی جا رہی ہے۔

ناول میں خالد اختر کے بہت سے خیالات اور تصورات محلِ نظر بھی ہیں۔ ان سے اختلاف کے کئی پہلو نکل ہی آتے ہیں۔ وہ سیکولر ذہن کے آدمی تھے اور پردے اور برقعے کے بارے میں انھوں نے جن آرا کا اظہار کیا ہے، ان سے اختلاف ممکن ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''بازاروں میں اول تو یہاں عورتیں نظر نہیں آتیں اور اگر آتی ہیں تو اپنے اوپر چمکتے ٹین کا ایک 'کیاسک' (kiosk) چڑھائے ہوئے ہیں۔ یہ کیاسک چوکور اور ستون نما ہوتا ہے۔ اس کے اوپر ایک ہیڈ لیمپ ہوتا ہے اور سائیڈ پر ایک آٹومیٹک ہارن۔ اس کے نیچے چار چھوٹے ربڑ ٹائر کے پہیے ہوتے ہیں جو سائیکل کے اصول پر زنجیر اور گراری سے گھومتے ہیں۔ چلانے والے کے ہاتھ پیڈل کیاسک کے اندر ہوتے ہیں۔ اس مشین کو ''نامحرم پیپا'' کہا جاتا ہے اور یہ خالص ماضنینی پیداوار ہے۔ درحقیقت یہی ایک مشین ہے جو ماضنین کی فیکٹریاں اس وقت خود بناتی ہیں۔'' (۱۳)

خالد اختر نے اپنے مؤقف کی پیش کش میں تمسخرانہ انداز اپنایا ہے۔ خالد اختر کو جو بات پچاس، پچپن برس قبل سوجھی تھی، فرانس کی حکومت کو نئی صدی کے آغاز میں اس کا خیال آیا ہے اور انھوں نے وہاں اسکارف کو ممنوع قرار دیا ہے اور باپردہ طالبات کے تعلیمی اداروں میں داخلے پر پابندی عائد کر دی ہے۔ اس پر سخت عوامی ردعمل دیکھنے میں آیا ہے۔ یہ ردعمل ایک جدید اور سیکولر ملک کے پردہ داروں کا ہے، ان حالات میں ''ماضنین'' میں رہنے والوں کو تنقید کا نشانہ بنانا درست معلوم نہیں ہوتا۔ خالد اختر دین اور سیاست کے اتحاد

کے بھی قائل نہیں۔ان کا خیال ہے کہ مذہب کے نام پر سیاست چمکائی جاتی ہے اور عوام کا استحصال کیا جاتا ہے۔وہ نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم سے بھی مطمئن نہیں۔ خالد اختر کی بعض آراء سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان آراء کی تشکیل میں غور وفکر سے کام نہیں لیا گیا ہے یا انھیں غیر تخلیقی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔انھوں نے اختلافی خیالات کا اظہار بھی اتنے فنکارانہ اور معروضی انداز میں کیا ہے کہ وہ ناقابلِ گرفت ٹھہرتے ہیں۔

''بیس سو گیارہ'' مصنف کے تہذیبی شعور کا آئینہ دار بھی ہے۔ان کے خیال میں تہذیبیں عروج کے بعد زوال پذیر ہوتی ہیں۔ ناول میں اسی تصور کی بازگشت موجود ہے۔ناول کے بارے میں مظہر جمیل سے انھوں نے کہا تھا:

> ''اس کے پیچھے خیال یہی ہے کہ اگر انسانی تہذیب پیچھے کی طرف چلنا شروع کر دے، یعنی ترقی معکوس ہو تو کیا صورت پیش آئے گی...'' (۱۴)

ناول میں مصنف نے مختلف قوموں کے تہذیب وتمدن پر جو تبصرے کیے ہیں وہ ان کی بصیرت اور آگہی کے غماز ہیں۔ یہ تبصرے بہت مختصر اور بہت جامع ہیں اور ان میں کسی تہذیب کے بنیادی خدوخال اجاگر کر دیے گئے ہیں۔وہ صرف ''کلچر'' ہی بیان نہیں کرتے بلکہ ''پنکچر'' کو بھی موضوع بناتے ہیں۔امریکہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''امریکہ بیسویں صدی کی تہذیب کا سب سے بڑا شارح اور سب سے اہم معمار تھا۔بعض مورخ کہتے ہیں کہ امریکہ کے پاس اس وقت گویا تہذیب کی اجارہ داری تھی۔ بہرحال امریکی کلچر یا امریکی تمدن اتنے بڑے پیمانے پر ہالی وڈ کی فلموں، اَن گنت میگزینوں اور کوکا کولا کی شکل میں دنیا کے ہر غیر مہذب ملک کو برآمد کیا جانے لگا تھا۔ بہت سے لوگوں کے تحت الشعور میں تہذیب اور 'امریکیانا' ایک ہی چیز کے دو نام ہو گئے۔ ہماری پود کو فراواں مواد کی وہ مصور امریکی میگزینیں یاد ہوں گی۔(وہ ان کے رنگین للچا دینے والے ناشتوں اور سگرٹوں اور وسکیوں کے اشتہار! وہ غیر مہذب ممالک میں غیر مہذبانہ واقعات کی خودنمائندہ خصوصی کی کھینچی ہوئی تصویریں! وہ ہر لفظ میں چمکتے ڈالر کی کھنک!) اس وقت کی بنی ہوئی ہالی وڈ کی بعض فلمیں اب بھی دیکھی جاسکتی ہیں، جرم تشدد اور جنسیت پر اپنی تاکید کے ساتھ... یہ امریکیانا وہ بلند تر امریکی کلچر نہیں — وہ آئن اسٹائن کی حیرت انگیز دریافتیں نہیں جو اس نے اپنے امریکہ میں قیام کے دوران کیں۔ وہ امریکی مصنفوں اور فلسفیوں کی پرواز نہیں۔ یہ امریکیانا کچھ فحش، کچھ متلی لانے والا ہے، امریکہ تہذیب کا سب سے لچر، سب سے پوچ بیرونی خول...'' (۱۵)

خالد اختر نے انگلستان، فرانس اور روس کے تہذیب وتمدن پر بھی روشنی ڈالی ہے اور جمہوری، سرمایہ داری اور اقتصادی نظاموں پر بھی فکر انگیز اور طنز آمیز تبصرے کیے ہیں۔

خالد علامت کے پردے میں بعض طنز کیے ہیں۔ ''کھلی ہوا کے عاشق'' غربت اور افلاس کی علامت ہیں اور سرمایہ داروں اور حکمرانوں پر ایک سچا اور کڑوا طنز۔ یہ ناول کو ترقی پسندانہ جہت عطا کرتے ہیں۔ ''کھلی ہوا کے عاشق'' غریب عوام ہیں اور ''روٹی، کپڑا اور مکان'' ان کے بنیادی مسائل ہیں۔ یہ ہوا کھاتے ہیں یا کیکڑے وغیرہ۔ یہ نیوڈسٹ اور نیچرسٹ ہیں اور سڑکوں، فٹ پاتھوں، پلوں اور جوہڑوں کے پاس کھلی ہوا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ حکومت انھیں ''حقوق ملکی'' سے محروم کر چکی ہے اور ''حقوقِ انسانیت'' سے محروم کرنے پر غور کر رہی ہے۔ ان میں سے بعض ''دوٹنگی'' ہیں یعنی کرائے پر چلنے والی انسانی سواری! یاد رہے کہ مصنف کا تعلق بہاول پور سے تھا جہاں ربع صدی پہلے تک سائیکل رکشے چلتے رہے ہیں۔ خالد نے ضعیف الاعتقادی، نسلی امتیاز، ادبی سیاست، جنس نگاری، رومانوی اور ترقی پسندانہ ادب پر بھی طنزیہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔

''بیس سو گیارہ'' ایک طویل طنز ہی بلکہ ایک ''لمبا قہقہہ'' بھی ہے۔ یہ شروع سے آخر تک دلچسپ اور شگفتہ انداز کا حامل ہے۔ فنتاسی یوں بھی زیادہ تر لطیف اور شگفتہ احساسات کو بیدار کرتی ہے اور اگر مصنف خالد اختر جیسا مزاح نگار ہو تو شگفتگی دو چند ہو جاتی ہے۔ مبالغہ آرائی (Exaggeration) فنتاسی کا لازمی جزو ہے اور مزاح کا ایک حربہ بھی۔ ناول میں حد درجہ مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ جس سے جابجا ہنسی کا ساماں پیدا ہوا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

> ''... میں نے سیٹ پر سے اچک کر پیچھے دیکھا تو چاروں پہلوانوں بتیشہ، گھونگا، گونگلو اور ملا بکری کو پیچھے سے موٹر کو دھکیلتے ہوئے پایا۔ انھوں نے یہ پتا نہیں لگنے دینا چاہا تھا کہ میری موٹر دھکیلی جا رہی ہے۔ اب میں ایک عوامی آدمی ہوں، بزفر سارجنٹ جانتا ہے کہ میں (صدر پوپو) سب آدمیوں کو برابر سمجھتا ہوں۔ میں نے اس وقت ایسی حرکت کی جو ڈپلومیٹک طریق سے کسی طرح جائز نہ تھی اور جس نے میرے میزبانوں کو قدرے پریشانی اور الجھن میں ڈال دیا یعنی میں پیچھے سے نیچے سڑک پر چاروں پہلوانوں کے درمیان کود آیا اور ان کے ساتھ مل کر موٹر دھکیلنے میں شامل ہو گیا میں نے پہلوانوں سے اصرار کیا کہ موٹر میں بیٹھ جائیں، اب ہماری ان کو دھکیلنے کی باری ہے اور میں نے بڑے کابو اور چھوٹے کابو کو بھی نیچے اتر کر میری مدد کو آنے کی دعوت دی۔ وہ چار و ناچار نیچے اترے...'' (۱۶)

ناول میں زیادہ تر مزاحیہ کرداروں اور مزاحیہ صورت حال سے پر تبسم اور قہقہہ بار فضا قائم ہوئی ہے۔ مرکزی کردار پوپو اور بزفر ہیں۔ یہ کرداروں کی ''جوڑی'' ہے۔ یہ جوڑی اپنی مضحک حرکات اور شوخ مکالمات سے قاری کو تبسم اور تفریح فراہم کرتے ہیں۔ یہ جوڑی مختلف ناموں، صورتوں اور عادتوں سے خالد اختر ہی کی تحریروں میں بار بار جلوہ گر ہوئی ہے۔ ایک بار قربان علی کٹار اور اقبال چنگیزی کے روپ میں اور دوسری مرتبہ چچا عبدالباقی اور بھتیجا بختیار کی شکل میں، مؤخرالذکر کردار ارتقائی صورت ہیں۔ ہوت بھی ایک ظریف کردار ہے۔ ناول میں مضحک صورتِ واقعہ بھی مزاح کی نمود کا باعث بنی ہے۔ واقعات ناقابل یقین ہیں اور قاری کو خوشگوار

حیرت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہ واقعات شرارتوں اور حماقتوں سے عبارت ہیں۔ ان میں کامیڈی یا کارٹون فلم کی سی غیر متوقع صورت حال پیدا کی گئی ہے اور جب کوئی واقعہ قاری کی توقع کے برعکس پیش آتا ہے تو بے ساختہ مسکرا اٹھتا ہے۔ صدر پوپو کے جلوس کی روانگی کا دلچسپ منظر دیکھیے:

''ہم شترابا میں پوپو پالنہار چوکا مانیفوگیٹ سے داخل ہوئے جو مقامی میونسپل کارپوریشن نے میرے اعزاز میں سارجنٹ بزفر کی خفیہ تحقیقات کے مطابق صرف پچھتر روبل بارہ سینٹ کی لاگت سے بنوایا تھا۔ مجھے یہ بالکل پسند نہ آیا اور ایسا لگا جیسے مجھے بھگتایا گیا ہے۔ دیکھنے میں یہ گو کافی ٹھوس معلوم ہوتا تھا مگر تھا یہ دراصل سارے کا سارا پتلی لکڑی کی چھتیوں کا ڈھانچا، جس پر سستے ٹین کے پترے لگا دیے گئے تھے۔ (پھر بھی شاید اس کساد بازاری کے زمانے میں یہ غنیمت تھا۔) پوپو گیٹ کے نیچے سے گزرتے وقت ہم پر اوپر سے پھول پھینکے گئے جو غلط ٹائمنگ کی وجہ سے بیشتر پیچھے ملا بکری پہلوان پر گرے۔'' (۱۷)

ناول میں صدر پوپو کے ماضنین کے ادب، آرٹ، حقوقِ نسواں اور سیاست کے بارے میں تاثرات اور مشاہدات بھی خاصے دلچسپ اور مزاحیہ ہیں لیکن راشد کی نظم ''انتقام'' اور فیض کی نظم مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' کی جو تحریف (parody) کی گئی ہے، وہ زیادہ متاثر کن نہیں ہے۔

خالد نے اپنے اس ناول کا عنوان انگریزی ناول ''نائنٹین ایٹی فور'' (۱۹۸۴) کے عنوان کی طرز پر قائم کیا تھا۔ اس ناول کے مصنف کا نام جارج آرویل (George Orwell) تھا۔ خالد نے براہ راست ''۱۹۸۴'' کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ وہ اس ناول سے تبصروں کی معرفت آشنا ہوئے تھے۔ ان کے بقول:

''اس فنتاسی کے لکھنے کا خیال پہلے پہل مجھے تب آیا جب میں نے مشہور انگریزی ناولسٹ مرحوم جارج آرویل کے حال میں شائع شدہ ناول ''نائنٹین ایٹی فور'' (۱۹۸۴) پر انگریزی ہفت ناموں میں ریویو پڑھے۔ یہ ناول بھی مستقبل کے متعلق ایک لاجیکل ناول ہے۔ میں نے اس کو ابھی تک نہیں پڑھا اور نہ ہی اسے یہاں کسی بک شاپ پر دیکھا ہے۔'' (۱۸)

جارج آرویل، فاشزم اور کمیونزم کا سخت مخالف تھا اور اس کا یہ ناول ظلم اور جبر پر مبنی حکومتوں پر ایک گہرا طنز ہے۔ ناول کی فضا خوف اور دہشت سے معمور ہے۔ خالد اختر کا ناول ایک مختلف نوعیت کی چیز ہے۔ اپنی اولین حیثیت میں گو یہ بھی ایک طنز ہے مگر یہاں مزاح اور مضحکہ خیزی نے ماحول کو خوشگوار بنا رکھا ہے۔ یہ ایک ہلکا پھلکا سیاسی اور معاشرتی طنز ہے۔ خالد کے مطالعے میں ''۱۹۸۴'' کے صرف تبصرے ہی آئے تھے اس لیے ''۲۰۱۱'' پر مذکورہ ناول کے اثرات کی تلاش سعی لاحاصل ہوگی۔ تاہم اس کے باوجود ''تبصروں'' کے اثرات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ تقابلی مطالعے کے نتیجے میں بعض دلچسپ مماثلتیں سامنے

آئی ہیں، مثلاً ''۲۰۱۱'' میں ہمارا تعارف ملک ماضنین کے متعدد وزراء سے کرایا جاتا ہے جن میں وزیرِ جھوٹ، وزیرِ جہالت، وزیرِ خوراک اور وزیرِ مالیات شامل ہیں۔(۱۹)

ادھر ''۱۹۸۴'' میں ملک اوشینیا (Ocenia) میں بھی مختلف وزارتیں قائم ہیں۔ان کے نام یہ ہیں:

"The ministry of Peace, The ministry of Truth, The ministry of Love, The ministry of plenty. (20)"

اوشینیا میں ایک نئی طرز کی سرکاری زبان Newspeak رائج تھی جس کی بنیاد انگریزی پر تھی مگر قواعد اور لفظیات میں بہت سی تبدیلیاں کر دی گئی تھیں۔ Newspeak کا مکمل تعارف ناول کے آخر میں Appendix میں کرایا گیا ہے۔(۲۱) ''۲۰۱۱'' کے اختتام پر ضمیمے میں ماضنین کی سرکاری زبان کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ یہ انگریزی اور سنسکرت کے تال میل سے وجود میں آئی ہے۔(۲۲)

ان مشابہتوں سے قطع نظر، دونوں ناول موضوع اور مزاج کے اعتبار سے دو مختلف تحریریں ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ مصنف کو ''۲۰۱۱'' لکھنے کی تحریک ''۱۹۸۴'' سے حاصل ہوئی۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ''۱۹۸۴'' کا شمار عالمی ادب کے اہم ناولوں میں کیا جاتا ہے کہ جب کہ ''۲۰۱۱'' کو اردو کے ظریفانہ ناولوں میں ممتاز مقام حاصل ہے۔

''بیس سو گیارہ'' مصنف کے سائنسی شعور کا عکاس بھی ہے۔ خالد اختر سائنس (الیکٹریکل انجینئرنگ) کے باقاعدہ طالب علم رہے تھے اور انھیں سائنس فکشن (Science Fiction) سے شغف بھی تھا۔ انھوں نے اپنے اس ناول کو ایچ جی ویلز (H.G.Wells) کی فنتاسیوں کی ناکام تقلید کہا ہے۔(۲۳) اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی نظر سے ایچ جی ویلز کے ناول The Time Machine اور The War of the World وغیرہ گزر چکے تھے۔ یہ بات ''سائنسی ادب'' سے ان کی گہری دلچسپی اور فطری مناسبت کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ دلچسپی اور مناسبت ان کے زیر بحث ناول میں واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے بلکہ سائنس فکشن کے طور پر بھی اس کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ سائنس فکشن کی جامع تعریف یہ ہے کہ:

"A novel, short story, play or the like, that combines science and fantasy. Science fiction deals with life in the future, in other galaxies, or in other fantastic situations, usually making much use of recent discoveries of technology and advances in science."(24)

''بیس سو گیارہ'' میں سائنس بھی ہے اور فنتاسی بھی، گو سائنس کم ہے اور فنتاسی زیادہ تاہم اس میں مستقبل کی دنیا کا نقشہ خوب جمایا گیا ہے اور اسی لیے مسعود اشعر نے خالد اختر کو Futuristic ناول نگار قرار دیا ہے۔(۲۵) ناول میں سائنس کی نئی ایجادات کا تذکرہ بھی ہے، مثلاً زمین سے زمین تک اُڑنے والے ایسے برق رفتار جہاز کا ذکر ہے جو لمحوں میں ہزاروں میل کا سفر طے کر سکتا ہے۔ خالد کی یہ بات نصف صدی کا قصہ ہو چکی ہے لیکن ابھی تک انسانی ذہن نے اتنی تیز رفتار سوای ایجاد کی نہیں۔ تاہم اس کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ناول میں آئن اسٹائن کا ذکر بھی ہے اور نائٹروجن بم کا بھی۔ ایٹمی تابکاری کا تذکرہ بھی ہے اور ایٹمی تباہ کاری کا

بھی۔ یہ ناول اس زمانے میں تصنیف ہوا جب ہیروشیما اور ناگاساکی کی بربادی کو چند برس ہی گزرے تھے لیکن ان واقعات سے مصنف کو یہ اندازلگانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ دنیا کی یہ جزوی تباہی، کلی تباہی کا پیش خیمہ بھی ہوسکتی ہے۔ یوں یہ ناول ایک سطح پر امن کا پیامبر ہے اور اہلِ دنیا کو ایٹمی جنگ کی تباہ کاریوں سے خبردار کرتا ہے۔ خالق تنویر کے بقول:

''یہ ناول ایک حساس تخلیق کار کا انسانیت اور انسانی مستقبل کے بارے میں بیم و رجا کے دھاگوں سے بنا ہوا خواب ہے، ایسا خواب جو دوسرے بہت سے لوگ بھی دیکھتے ہیں لیکن اس کے اظہار پر قادر نہیں ہوتے۔ جدید ایٹمی اسلحے، اس کی تباہ کاریوں سے نفرت، انسانی المیے کی ذمے دار قوتوں کے خاتمے پر دبی دبی خوشی، اعلیٰ تہذیبوں کے مٹنے کا ملال، نئی دنیاؤں کی تشکیل اور ان میں قدیم پرویزی حیلوں کی کارفرمائی جیسے اہم موضوعات اور طنز و مزاح کی تازگی نے اس ناول کو ایک منفرد تخلیق کا مقام دے دیا ہے۔'' (۲۶)

خالد اختر کی یہ تخلیق ایک ''پرامن ناول'' ہے اور اردو فکشن میں سائنسی شعور کا نقطۂ آغاز بھی۔ اردو ادب میں تاحال سائنس فکشن کی روایت پنپ نہیں سکی۔ ''ہوسکتا ہے آنے والے ادوار میں ہمارے یہاں بہترین فنتیائی ناول لکھے جائیں جن میں سائنسی کرشمے پیش کیے جائیں کیوں کہ سائنسی ترقی کا ماحول اس قسم کی تحریروں کے لیے بڑی بنیاد فراہم کرتا ہے۔'' (۲۷) اردو دنیا فی الحال کسی بڑے ''سائنسی ناول'' کی منتظر ہے۔

ناول کا پلاٹ بہت سادہ اور آسان ہے۔ واقعات ایک ترتیب اور بہاؤ میں رونما ہوتے جاتے ہیں۔ کوئی پیچیدگی نہیں، ایک کہانی کی سی سادگی ہے۔ جہاں تک خالد کے اسلوبِ بیان اور زبان کا تعلق ہے تو وہ ہمیشہ سے زیرِ بحث رہے ہیں اور انھیں تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر انگریزی ادب کے قاری تھے اور ان کا اپنا کہنا تھا کہ وہ انگریزی میں سوچتے ہیں اور اسے اردو میں منتقل کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں جملوں کی انگریزی ساخت، بدیسی محاورے کا اردو ترجمہ، اور انگریزی الفاظ کا استعمال عام ہے۔ ''بیس سو گیارہ'' ان کا اولین ناول تھا اور اس میں یہ رجحان غالب ہے۔ انگریزی الفاظ تو اس میں لاتعداد ہیں۔ انھوں نے اس کی توجیہ بھی کی ہے:

''میں نے سب نیک نصیحتوں کے خلاف اس فینتاسی میں بلادھڑک انگریزی الفاظ اور انگریزی مطالب استعمال کیے ہیں۔ اس کے لیے مس قرالعین حیدر نے پہلے ہی آئندہ مصنفوں کے لیے راستہ صاف کر دیا ہے... اس رسم کے پہلے پائنیر خود سرسید اور شبلی تھے۔'' (۲۸)

یہ کوئی اتنا بہتر عذر اس لیے نہیں کہ زبانِ غیر کی غیر تخلیقی آمیزش ہر جگہ قابلِ اعتراض ہوگی۔ جہاں تک جملوں کی انگریزی بناوٹ کا معاملہ ہے تو یہ خالد کا اسلوب ہے جو اردو کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کرتا ہے۔ بعض مقامات پر وہ حد سے گزر گئے ہیں لیکن ان کی اس بات سے اتفاق کرتے ہی بنتی ہے:

''میرے نزدیک زبان کا چپٹا اور بے جان ہونا اس کے غلط اور چونکا دینے والی ہونے سے زیادہ ناقابلِ معافی گناہ ہے... اردو سے بہت زیادہ دیر تک ایک پاک دامن کنواری کا سا سلوک کیا جاتا رہا ہے۔ روزمرہ یا محاورے میں ایک لفظ ادھر سے ادھر سرکا دینا گویا قیامت ڈھا دینا ہے اور زبان کے اونچے پروہت اس کفر پر تھرا اُٹھتے ہیں۔ مجھے اس انداز، اس زود حسی سے مطلقاً ہمدردی، کیوں کہ میں اردو کو اتنی چھوئی موئی سے نہیں سمجھتا کہ وہ تھوڑی سی بے تکلفی اور بے ادبی بھی برداشت نہ کر سکے۔'' (۲۹)

اردو زبان میں واقعی اخذ و انجذاب کی صلاحیت ہے اور خالد کا نقطۂ نظر قابلِ غور ہے۔

''بیس سو گیارہ'' پر زبان و بیان کے حوالے سے ہونے والی تنقید سے خالد اختر محتاط ہو گئے۔ بعدازاں انھوں نے فصیح زبان سیکھنے کی شعوری کاوش بھی کی لیکن وہ اپنے بنیادی انگریزی طرزِ ادا پر مبنی اسلوب سے کبھی دست کش نہ ہوئے۔ انھوں نے اچھا ہی کیا ورنہ اردو ادب ایک صاحبِ اسلوب ادیب سے محروم ہو جاتا!

''بیس سو گیارہ'' مرکب اور مخلوط انداز کا ناول ہے۔ اس میں فنتاسی کے امکانات اور سائنس کے کمالات کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایک سطح پر علامتی ناول ہے اور دوسری جانب اسے حقیقت نگاری کی ایک واضح مثال بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں ماضی بیزاری کا رویہ بھی موجود ہے اور مستقبل شناسی کا انداز بھی پایا جاتا ہے۔ اس میں مضحک کرداروں کی شوخیاں اور شرارتیں بھی دکھائی گئی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ سیاست و معاشرت پر تیر اندازی بھی کی گئی ہے۔ یہ بظاہر ایک شگفتہ اور مزاحیہ ناول ہے لیکن معنوی اعتبار سے طنزیہ اور سنجیدہ تحریر ہے۔ یوں مختلف اور متضاد کیفیات کی آمیزہ کاری نے اسے ایک منفرد طرز کا ناول بنا دیا ہے۔

حوالے:

(۱) خالد اختر: ''بیس سو گیارہ'' (کراچی: آج کی کتابیں، سٹی پریس بک شاپ، طبع دوم ۱۹۹۹ء)، ص ۸، ۹

(۲) خالد اختر: انٹرویو: علی تنہا، پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن، آہنگ، اگست ۱۹۸۷ء، ماہنامہ جلد، ۴۰، شمارہ ۱۰، ص ۳۸

(۳) بیس سو گیارہ، ص ۱۰

(۴) ایضاً، ص ۹، ۱۰

(۵) خواجہ محمد زکریا: (تبصرہ نگار)، ماہنامہ ''تخلیق'' (لاہور: جلد ۳۲، شمارہ ۱۰) ص ۱۳۴

(6) Chris Baldic, The concise Oxford Dictionary of Literary Terms, Oxford University Press, New York, 1990, P.81-82

(۷) ممتاز احمد خان: آزادی کے بعد اردو ناول — ہیئت اسالیب اور رجحانات، (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۷ء)، ص ۵۱

(۸) فہمیدہ ریاض: رنگا رنگ ادیب — خالد، فنون (لاہور: شمارہ ۳، نومبر دسمبر ۱۹۷۶ء)، ص ۵۴

(۹) مظہر جمیل: نیرنگ محمد خالد اختر، مکالمہ (کراچی: کتابی سلسلہ ۸/جولائی ۲۰۰۱ء، جون ۲۰۰۲)، ص ۳۵۶

(۱۰) محمد کاظم سید: محمد خالد اختر کا فن، ماہنامہ "نصرت" (لاہور: جلد ۶، شمارہ: ۵، ۶، مئی جون ۱۹۶۴ء)، ص ۲۶

(۱۱) بیس سو گیارہ، ص ۶۰

(۱۲) ایضاً، ص ۴۸، ۴۹

(۱۳) ایضاً، ص ۶۶، ۶۷

(۱۴) مظہر جمیل: نیرنگ محمد خالد اختر، مکالمہ، ص ۳۴۸

(۱۵) بیس سو گارہ، ص ۱۳، ۱۴

(۱۶) ایضاً، ص ۳۳

(۱۷) ایضاً، ص ۳۱، ۳۲

(۱۸) ایضاً، ص ۱۰

(۱۹) ایضاً، ص ۴۷ تا ۵۷

(20) George Orweil: 1984, Source Url: II www.constitution. org/orwell/1984, htm P.2

(21) George Orwell: 1989, P.146-152

(۲۲) بیس سو گیارہ، ص ۱۴۱، ۱۴۲

(۲۳) ایضاً، ص ۱۰

(24) Clarence L. Barnhart and Robert K. Barnhart, The World Book Dictionary, World Book Inc. a scott Fetzer company, London Vol. 2, P.1863

(۲۵) مسعود اشعر: ۲۰۱۱ منفی ۹ (محمد خالد اختر کی یاد میں) فنون (لاہور: شمارہ ۱۱۶، اکتوبر ۲۰۰۱ء۔ مارچ ۲۰۰۲ء)، ص ۲۶

(۲۶) ڈاکٹر خالق تنویر: ڈاکٹر، محمد خالد اختر۔ ایک مطالعہ، سہ ماہی معاصر (لاہور: جلد ۱، ۲۰۰۱ء، شمارہ ۳، ۴ جولائی)، ص ۸۵

(۲۷) ممتاز احمد خان: آزادی کے بعد اردو ناول — ہیئت، اسالیب اور رجحانات، ص ۵۲

(۲۸) بیس سو گیارہ، ص ۹

(۲۹) ایضاً، ص ۹

غالب کی بعض تصانیف

از

کالی داس گپتا رضا

صفحات: ۱۵۴ قیمت: ۱۲۰ روپے

رفتارِ ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

النور

سید محمد سلیمان اشرفؒ

صفحات: ۳۱۴، قیمت: ۳۳۰ روپے

ادارہ پاکستان شناسی ۲/۲۴، سودھیوال کالونی، ملتان روڈ، لاہور

مبصر: محمد احمد سبزواری

بعض کتابوں کے عنوانات سے مغالطہ ہو جاتا ہے کہ ان کا موضوع کیا ہے، النور اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ہے، لہٰذا اس کتاب کو کسی مذہبی موضوع پر ہونا چاہیے مگر اس کا موضوع سیاسی ہے، یہ تحریکِ خلافت اور ترک موالات سے متعلق ہے، ہماری نئی پود تو ان اصطلاحات سے واقف نہیں مگر مرحوم سلیمان اشرف صاحب نے کچھ پردہ نشینوں کے حجابات چاک کر کے سب کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔

سید محمد سلیمان اشرف صاحب کی یہ کتاب ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی تھی اور اب ایک طویل تکمیل مقدمہ کے ساتھ دوبارہ شائع ہوئی ہے، مرحوم مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں شعبہ دینیات کے صدر تھے۔

تحریک خلافت اور ترک موالات سے کیا مراد ہے؟ نبی کریمؐ کی اس دنیا سے پردہ پوشی کے بعد نائب رسول اور مسلمانوں کے امیر کو خلیفہ کہا گیا۔ یہ عہدہ خلفائے راشدین بنوامیہ، بنوعباس سے ہوتا ہوا سلاطین عثمانیہ کے پاس آ گیا، ایک وقت سلطنت عثمانیہ ایک عظیم سلطنت تھی، مگر رفتہ رفتہ مائل بہ زوال ہوتی رہی۔ پہلی عالمگیر جنگ میں جرمنی کا ساتھ دینے اور اس کی شکست کے بعد اتحادیوں نے اس کے حصے بقرے کر دیے۔ ادھر خود ترکی کے نوجوانوں نے غازی مصطفیٰ کمال پاشا (بعد میں اتاترک) اور عصمت پاشا نے خلافت کے خاتمے کا منصوبہ بنایا۔ گو ایک عرصے سے ہندوستان کے مسلمانوں اور ترکی کے درمیاں کوئی مذہبی مفاہمت نہیں تھی سوائے اس کے کہ جمعہ کے روز مساجد میں خطبے میں سلطان کا نام بطور خلیفہ لیا جاتا تھا۔ خلافت کے خاتمے کے منصوبے سے ہند کے مسلمانوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی، پرنس آغا خان اور سید امیر علی نے عصمت پاشا سے اپیل کی کہ خلافت کو باقی رکھا جائے۔ خلافت کمیٹی بنی، خلافت فنڈ قائم ہوا، خواتین نے اپنے زیورات پیش کیے، ان کے جذبات کی عکاسی اس نظم سے ہوتی ہے جس کا ایک شعر یہ تھا۔ ''بولیں اماں محمد علی کی۔ جان بیٹا خلافت پہ دے دو۔'' ایک طبی وفد ڈاکٹر انصاری کی زیرنگرانی ترکی گیا، ملک کے طول وعرض میں جلسے ہوئے، گاندھی جی نے اس تحریک میں شرکت کی، وائسرائے ہند سے جو وفد ملا اس میں گاندھی جی بھی شامل تھے، مولانا محمد علی جوہر کی زیر

قیادت ایک وفد برطانوی حکومت سے بات کرنے لندن گیا۔ ایک قرارداد منظور کی گئی کہ اگر حکومت برطانیہ مسلمانوں کے مطالبات تسلیم نہیں کرتی تو مسلمان حکومت سے عدم تعاون کریں، ولایتی مال کا بائیکاٹ کریں، خطابات واپس کریں، ساتھ ہی گاندھی جی اور دوسرے ہندو لیڈروں کا شکریہ ادا کیا گیا کہ انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ اشتراک کیا۔

تحریکِ خلافت کے حامیوں میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی کفایت اللہ، مولانا حسرت موہانی، مولانا عبدالباری، حکیم اجمل خاں (جنھوں نے خطاب واپس کیا) سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد بدایونی راجہ صاحب محمود آباد وغیرہ تھے۔ صرف علامہ اقبال اور (قائداعظم) محمد علی جناح اس تحریک میں شامل نہیں تھے۔ یہی وفد یورپ کا دورہ کر رہا تھا کہ ''معاہدہ سیورلے'' پر دستخط ہوئے اور ترکی کے حصے بقرے کر دیے گئے۔ گاندھی جی نے بہت جلد تحریک سے پیچھا چھڑا لیا۔ اب عدم تعاون کی تحریک عملاً شروع ہوگئی۔ یہ خالص جذباتی تحریک تھی مگر اس سے مسلمانوں کو تین اہم مسئلوں کی صورت میں نقصان اٹھانا پڑا۔ پہلا مسئلہ گاؤکشی کا تھا، چوں کہ ہندوؤں نے تحریکِ خلافت میں حصہ لیا تھا اس لیے بیشتر مسلمان لیڈروں اور اکثر علما نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ ہندوؤں کی تالیف قلوب کے لیے گاؤکشی سے پرہیز کیا جائے۔

دوسرا مسئلہ ترک موالات کے سلسلے میں یہ اٹھا کہ ''مسلمان اپنے بچوں کو اسلامیہ کالجوں وغیرہ میں پڑھانا چھوڑ دیں۔'' وہ اسلامیہ کالج علی گڑھ اور اسلامیہ کالج لاہور کو بند کرانا چاہتے تھے۔ ابوالکلام آزاد کا ارشاد دیکھیے، ''احکام شرعیہ کی رو سے کسی مسلمان طالب علم کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی سرکاری یا ایسے کالج میں تعلیم حاصل کرے جو سرکار سے امداد قبول کرتا ہو یا سرکاری یونی ورسٹی سے ملحق ہو۔'' مفتی کفایت اللہ، مولوی احمد سعید ناظم جمعیتہ علمائے ہند نے ان کی تائید کی اور بالخصوص شیخ الہند کے فتویٰ کی وجہ سے اکثر لڑکوں نے مسلم یونی ورسٹی کا بائیکاٹ کر دیا۔ کچھ ''مجاہدین'' نے علی گڑھ کالج پر ہلّہ بھی بولا لیکن ڈاکٹر ضیاء الدین حبیب الرحمٰن شیروانی اور سید سلیمان اشرف کی کوششوں سے کالج مکمل شکست وریخت سے بچ گیا۔

اسی طرح اپیلیں لاہور میں اسلامیہ کالج کو بند کرانے کے لیے بھی کی گئیں۔ امام احمد رضا خان اور مولوی حاکم علی فتووں کی بدولت کالج محفوظ رہا مگر کچھ طلبا نے کالج چھوڑ دیا۔ پھر تیسرا مسئلہ ہجرت کا تھا، حضرت شاہ عبدالعزیز سو سال پہلے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے چکے تھے، چناں چہ اب تحریکِ خلافت نے اس مسئلہ کو پھر اٹھایا اور ہزاروں سادہ لوح مسلمان اپنی ملازمتیں چھوڑ کر جائیدادیں فروخت کر کے بیویوں کو طلاق دے کر خاندان والوں کو بلکتا چھوڑ کر پشاور کے راستے کابل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان میں اچھی خاصی تعداد راستے ہی میں مختلف امراض کا شکار ہو کر جان بحق ہوگئی، افغانستان میں بھی ان کا پُرجوش استقبال نہیں ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد لٹا کر واپس آنے پر اکثر کو گداگری کرنا پڑی۔ اس کتاب میں ان ہی واقعات کے حوالوں سے تفصیل دی ہوئی ہے۔

تحریکِ خلافت کے سلسلے میں ہمارے یہاں ایک خاص نقطۂ نظر موجود ہے، لیکن علمی اور جمہوری تقاضا یہ بھی ہے کہ دوسرے نقطۂ نظر کو بھی سنا جائے اور اس کا تجزیہ کر کے نتیجہ نکالا جائے۔ یہ کتاب ایسا ہی تقاضا کرتی ہے۔ اس میں حوالوں سے تفصیلات دی ہوئی ہیں۔ قاری چاہے تو قبول کرے یا مسترد کر دے۔

مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی

مرتب: ارشد محمود ناشاد

صفحات: ۲۲۰، قیمت: ۲۲۵ روپے

ادبیات، رحمٰن مارکیٹ، غزالی اسٹریٹ اردو بازار، لاہور

مبصر: قاسم محمود احمد

جناب رشید حسن خاں اعلیٰ پائے کے محقق اور مدوّن تھے۔ اصولِ تحقیق و تدوین اور املا کے موضوع پر ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ خاں صاحب ہمیشہ معیارِ تحقیق کے کڑے اصولوں کے قائل رہے۔ ۳۴ برس کا طویل عرصہ بیوی بچوں سے دور دہلی میں گزارا اور ایسے علمی و ادبی کارنامے انجام دیے جو کسی فردِ واحد سے زیادہ انجمنوں اور اداروں کے کرنے کے تھے۔ وہ تمام عمر آرام و آسائش کو تج کر اور گوشہ نشینی اختیار کر کے شکوۂ ظلمتِ شب کے بجائے اپنے حصے کی شمع جلاتے رہے۔ خاں صاحب ۲۶ فروری ۲۰۰۶ء کو دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

زیرِ نظر کتاب ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے نام ان کے پچاس خطوط پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر ہاشمی پنجاب یونی ورسٹی سے ۲۰۰۲ء میں بطور صدر شعبۂ اردو سبکدوش ہوئے تھے۔ بعد ازاں شعبۂ اقبالیات پنجاب یونی ورسٹی سے بطور ایچ ای سی ایمی نٹ Eminent پروفیسر وابستہ رہے۔ ان دنوں وہ بطور رفیق علمی، اقبال اکادمی پاکستان اور ادارہ معارفِ اسلامی لاہور کے بعض علمی منصوبوں پر کام کر رہے ہیں۔ وہ اقبالیات پر سولہ سترہ تصانیف و تالیفات کے علاوہ دیگر علمی و ادبی موضوعات پر بھی لگ بھگ بیس کتابیں شائع کر چکے ہیں جن میں ''تفہیم و تجزیہ''، ''سرور اور فسانہ عجائب''، ''اصنافِ ادب'' اور دو سفرنامے (اندلس اور جاپان) شامل ہیں۔

ایک محقق کے خطوط دوسرے محقق کے نام ہوں تو قارئین ادب کے لیے گنج گراں بہا سے کم نہیں۔ اردو ادب میں خطوط کی روایت کوئی زیادہ پرانی نہیں، غالباً اس روایت کا نقش اول غالب ہیں جنھوں نے خطوط کو ایک علمی و ادبی معیار عطا کیا۔ اس کے بعد خطوط کی ترتیب و تدوین کی طرف توجہ دی جانے لگی۔ اقبال کے خطوط کے کئی ایک مجموعے طبع ہوئے اور اب وہ ''کلیات مکاتیب اقبال'' کی صورت میں چار جلدوں میں چھپ چکے ہیں۔ مشفق خواجہ کے خطوط کے متعدد مجموعے منظر عام پر آئے ہیں ۱۴۳ خطوط پر مشتمل ایک مجموعہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے بھی مرتب کیا ہے یہ سب خطوط انھی کے نام ہیں۔

اگرچہ خطوط مکتوب الیہ کا سراسر ذاتی اور نجی سرمایہ ہوتا ہے تاہم علمی و ادبی موضوعات پر مشاہیر کی وقیع آرا، تبصرے اور خیالات دوسروں تک پہنچا دینا ادبی دنیا پر احسان کا درجہ رکھتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے مرتب کی ہے۔ اس میں رشید حسن خاں کے پچاس خطوط بنام رفیع الدین ہاشمی کے علاوہ ۹ خطوط بنام عبدالوہاب خاں سلیم، دو خطوط بنام تحسین فراقی اور ایک خط بنام مدیر ''ترجمان القرآن'' بھی شامل ہیں۔ اس طرح کل باسٹھ خطوط ہوئے۔ ان خطوط سے رشید حسن خاں کے معیارِ تحقیق و تدوین، ان کی علمی جستجو، کدوکاوش اور تحقیق کی راہ میں پیش آمدہ مشکلات کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے ساتھ مل کر ''کلیاتِ اقبال'' کا تحقیقی ایڈیشن مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا مگر ان کی وفات سے وہ تشنۂ تکمیل رہ گیا۔

ان خطوط میں رشید صاحب کبھی کسی کتاب کی فرمائش کرتے ہیں اور کبھی مکتوب الیہ کو کوئی کتاب بھیجتے ہیں۔ بعض اوقات کسی بات

پر خفا نظر آتے ہیں اور کبھی اظہار مروت کرتے ہیں۔ مکتوب الیہ کو اپنے تحقیقی منصوبوں سے آگاہ کرتے ہیں اور مشورہ بھی دیتے ہیں۔ اس سے ان کی تحقیقی و علمی لگن کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

ان کی تحریر سنجیدہ اور شگفتہ ہے۔ ثقیل الفاظ سے گریز کرتے ہیں، محاورات کا برمحل استعمال کرتے ہیں، مثلاً ۱۷ر جون ۱۹۹۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''پچھلے بیس دن سے طبیعت ٹھیک نہیں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب دھوپ دیوار سے ذرا تیزی سے اترنے لگی ہے۔ بخار ہے، پیروں میں درد ہے اور نا معلوم کیا کیا۔''

کبھی کبھی ان کے خطوط میں ہلکا سا مزاح بھی ملتا ہے، اسے تحریر لطیف کہنا چاہیے مثلاً کہتے ہیں:

''اس گناہ گار، پریشاں احوال، دور افتادہ با جسم نزار، نیاز مندِ باوفا خیر خواہِ باصفا کا سلام قبول ہو۔ یہ شخص بروقت عدم تعمیلِ فرمائش پر شرمسار اور سرافگندہ ہے؛ اگر خوے کریمانہ سے کام لے کر اس کی معذرت قبول ہو تو آپ ثواب دارین کے مستحق قرار پائیں گے۔''

درحقیقت خاں صاحب کے خطوط ہمارے علمی و ادبی ذخیرے میں بیش بہا اضافے کا سبب ہیں۔ ان خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق کی راہ کتنی کٹھن اور پرخار ہے۔ انھوں نے زندگی کا زیادہ تر حصہ تحقیق کی نذر کر دیا اور ہمیشہ اپنی اس زندگی پر مطمئن رہے:

شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

یہ کتاب تدوین کے اعلیٰ معیار پر بھی پوری اترتی ہے۔ خطوط کو زمانی ترتیب دی گئی ہے۔ چند خطوں کے عکس بھی شاملِ کتاب ہیں۔ خاں صاحب مکتوب الیہ کو اپنی جو تصانیف بطور تحفہ بھجواتے رہے، مجموعے میں ان کے سرورق کے عکس بھی دیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر ناشاد صاحب نے حواشی و تعلیقات پر خاصی محنت کی ہے۔ کتاب پر مفصل دیباچہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (مکتوب الیہ) نے لکھا ہے۔ ''عرض مرتب'' کے نام سے دیباچے میں ان تدوینی اصولوں کی وضاحت کی ہے جن کے تحت یہ خطوط مرتب کیے گئے ہیں۔ آخر میں کتب و رسائل، اشخاص اور اماکن پر مبنی اشاریہ (از راقم) بھی شامل ہے۔

صبا اکبر آبادی کی غزل نگاری

تدوین و ترتیب: شفیق احمد شفیق

صفحات: ۳۰۴، قیمت: ۲۵۰ روپے

پیش رفت (انٹرنیشنل) ۱۱۸۰ بلاک ۱۸، سمن آباد فیڈرل بی ایریا کراچی

مبصر: ڈاکٹر جاوید منظر

اردو زبان و ادب کو اہلِ قلم نے ہمیشہ اعتبار بخشا ہے اور ورثے کو نئی نسل کی طرف منتقل کیا ہے صبا اکبر آبادی اس ہراوّل دستے میں شامل ہیں۔ ہر صنف سخن میں صبا صاحب نے طبع آزمائی کی ہے۔

شفیق احمد شفیق نے صبا اکبر آبادی کی غزل کو ہی محور بنایا ہے۔ عنوان ہے ''صبا اکبر آبادی کی غزل نگاری''۔ ولی دکنی اور قلی قطب شاہ سے

لے کر موجودہ دور تک غزل نے اپنی اہمیت کو منوایا ہے۔ اَن گنت شعرا نے غزل کی بدولت اپنا نام اردو زبان و ادب میں رہتی دنیا تک امر کروالیا ہے۔ مگر ان شعرا میں سے چند غزل گو ایسے ہیں جنھوں نے غزل کو اعتبار بخشا ہے صبا اکبرابادی بھی انھیں غزل گو شعرا میں سے ایک ہیں۔

زیر مطالعہ کتاب جس میں صبا اکبر آبادی کی غزل نگاری کے حوالے سے دنیائے علم و ادب کے جن معروف اہل قلم نے اظہار کیا ہے ان میں چند کے نام ہیں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، فیض احمد فیض، احسان دانش، پروفیسر ممتاز حسین، پروفیسر مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر احسن فاروقی، احمد ندیم قاسمی، جمیل الدین عالی ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، افسر ماہ پوری، الیاس عشقی، تسلیم الٰہی زلفی عبداللہ جاوید، احمد ہمدانی، حفیظ جالندھری، پروفیسر فراق گورکھپوری، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، شہزاد احمد وغیرہ۔

شفیق احمد شفیق نے عرق ریزی کے ساتھ اس اہم کتاب کی تدوین و ترتیب کی ہے کتاب کو صبا اکبر آبادی اور دوسرے اہل کی نادر تصاویر سے آراستہ کیا گیا ہے۔

''پیش رفت انٹرنیشنل'' نے بلاشبہ اردو غزل کے حوالے سے اہم کارنامہ انجام دیا ہے جس کے لیے یہ ادارہ مبارک باد کا مستحق ہے۔

سرورق کی لڑکی

ظفر محی الدین

صفحات: ۱۴۶، قیمت: ۱۵۰ روپے

دائرہ ادب و ثقافت، کراچی

مبصر: عشرت رومانی

افسانہ نگار و کالم نویس ظفر محی الدین کے زیر تبصرہ مجموعے میں شامل تیرہ افسانوں میں ہمارے معاشرتی مسائل جلوہ گر ہیں، کہیں کہیں ان کے یہاں تخیل کی پرواز کی بلندی قابل ذکر ہے۔ مثلاً افسانہ ''لازوال'' میں انھوں نے ایک نیا موضوع لے کر لیڈی ڈائنا کے مومی مجسمے سے پوری کہانی بنا دی ہے یہ یقیناً ایک اچھوتا خیال ہے، اس طرح ''آخری معرکہ''، ''بڑا آدمی''، ''بالے کا ڈھابا'' اور ''بڑے گھر کی بہو'' جیسے افسانے بھی انھی خطوط پر تخلیق کیے گئے ہیں۔ میرے نزدیک ان افسانوں میں ہمارے دور کی واضح حقیقتیں، تلخیاں اور المیے سب ملتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں فطرت کا حسن، انسانی ذہن کی پیچیدگی، مادی دنیا کی ضرورتیں اور انسان کی اچھائیوں اور برائیوں دونوں کا گہرا ادراک پایا جاتا ہے۔ ان کا اسلوب سادگی اور پرکاری کا مجموعہ ہے ان کے یہاں ماجرا بھرپور انداز سے سامنے آتا ہے اور اپنے آپ کو پڑھواتا ہے۔ مجموعی طور پر ان کے افسانوں کا لب و لہجہ کہیں بلند آہنگ، کہیں دھیما اور کہیں روایتی سا ملتا ہے۔

بحیثیت کہانی نویس ''سرورق کی لڑکی'' ان کا پہلا مجموعہ ہے، میری دعا ہے کہ وہ کالم نگاری کے ساتھ ساتھ مزید افسانے لکھیں۔ میری نظر میں کتاب کی ضخامت مناسب اور کاغذ اور طباعت بھی معیاری نیز قیمت بھی مناسب ہے۔

گرد و پیش

مرزا قلیچ بیگ عالمی کانفرنس کا انعقاد

وزیر برائے ثقافت و سیاحت حکومت سندھ، محترمہ سسی پلیجو نے کہا ہے کہ مرزا قلیچ بیگ سندھی ادب کے معمار ہیں اور ان کی شخصیت اور حیثیت سندھی علم و ادب کی ترقی اور ترویج میں سب سے محترم ہے۔ انھوں نے ان خیالات کا اظہار مرزا قلیچ بیگ عالمی کانفرنس کے موقعے پر مہمان خصوصی کے طور پر کیا۔ انھوں نے کہا کہ مرزا کی سندھی ادب کے لیے کی جانے والی خدمات کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ انھوں نے بحیثیت مولف، مصنف اور مترجم ۴۵۷ کتابیں لکھیں، جو سندھی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ گزشتہ ۸۰ برس میں کسی اور نے اتنی بڑی تعداد میں کتابیں نہ ترجمہ کی ہیں اور نا ہی لکھی ہیں۔ انھیں بیک وقت سندھی، انگریزی، فارسی، عربی، ترکی، بلوچی، اور اردو زبانوں پر کمال حاصل تھا۔ ان کی علمی و ادبی قابلیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ انھیں لطیفیات، تاریخ ناول نگاری، ڈرامہ نگاری، تنقید، شاعری، مذہب، سوانح، لغت، سائنس، لسانیات، گرامر، موسیقی، زراعت اور باغبانی جیسے اہم موضوعات پر کئی کتابیں لکھیں انھوں نے انگریزی اور دیگر زبانوں سے شاہکار اور کلاسیکل ادب کو سندھی میں منتقل کیا۔ محکمہ ثقافت و سیاحت حکومت سندھ نے مرزا جیسی عظیم اور بلند پایہ شخصیت کے اعزاز میں ان کے حوالے سے ایک چیئر قائم کی ہے جو گزشتہ برس سندھ یونی ورسٹی میں اسپانسر کی گئی تھی اور اس کے لیے ابتدائی طور پر ۱۰ لاکھ روپے کی گرانٹ بھی رکھی گئی تھی۔ اس موقعے پر محترمہ سسی پلیجو صاحبہ نے مرزا قلیچ بیگ چیئر کے لیے سالانہ ۱۰ لاکھ روپے مستقل گرانٹ کا بھی اعلان کیا۔ انھوں نے کہا کہ مرزا قلیچ بیگ چیئر علمی ادبی میدان میں تحقیق، سیمینار اور کانفرنسز کے انعقاد کے علاوہ نوجوان محققین کی رہنمائی بھی کرے گی۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی سندھی ادیبوں کو ویزا نہ ملنا نہایت ہی افسوس ناک ہے۔ تین روزہ اس کانفرنس میں ملکی و غیر ملکی ممتاز اسکالرز اور ادیبوں نے شرکت کی جن میں ڈاکٹر فاطمہ حسن، ڈاکٹر محمد حسین تشبیہی، ڈاکٹر مہدی پتولی، فخر زمان، زنیرا یوسف، ڈاکٹر سید مہاج الحسن، ڈاکٹر شاہد اقبال کامران اور دیگر نے شرکت کی۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

آرٹس کونسل میں ڈاکٹر عالیہ امام کے اعزاز میں تقریب

ممتاز شاعر نقاش کاظمی نے کہا ہے کہ ڈاکٹر عالیہ امام کے پاس علم و دانش کا سمندر ہے۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے آرٹس

کونسل میں ڈاکٹر عالیہ امام کے اعزاز میں منعقدہ تقریب پذیرائی کے موقعے پر بحیثیت مہمان خصوصی اپنے خطاب میں کیا۔ ان کی کتاب ''اکیسویں صدی میں ادب اور سائنس'' نہایت اہمیت کی حامل ہے، آرٹس کونسل کی ٹاک شو کمیٹی کے چیئرمین حسن ظہیر نے کہا کہ ڈاکٹر عالیہ امام کئی زبانوں کی عالم ہیں۔ انھوں نے جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی جیسے دانشورانِ ادب کی رفاقت میں سوسائٹی کی بہتری کے لیے عملی اقدامات کیے۔ آرٹس کونسل کے سیکرٹری محمد احمد شاہ نے کہا کہ ڈاکٹر عالیہ امام ایک بے باک اور جرأت مند خاتون ہیں اور فلسفیانہ فکر و نظر کی مالک ہیں جو معاشرے میں امن و امان اور انصاف کا بول بالا چاہتی ہیں۔ ڈاکٹر عالیہ امام نے اس موقع پر اپنی کتاب سے چند اقتباسات پیش کیے اور سامعین کے سوالوں کے جوابات بھی دیے۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

اختر شیرانی میموریل ٹرسٹ کی تقریب

ممتاز محقق و پروفیسر یونس حسنی نے کہا ہے کہ اختر شیرانی کی شہرت نظم نگار کی حیثیت سے ہے لیکن وہ بہت اچھے نثر نگار اور غزل گو بھی تھے۔ وہ غزل اور نظم کے بنیادی فرق سے آگاہ تھے۔ وہ نرم اور شیریں الفاظ کے استعمال میں ملکہ رکھتے تھے۔ یہ بات انھوں نے یہاں اختر شیرانی میموریل ٹرسٹ کے زیر اہتمام اختر شیرانی کی یاد میں منعقدہ نشست سے خطاب کرتے ہوئے کہی، جس کی صدارت بزرگ ادیب مسعود احمد برکاتی نے کی۔ مقررین میں ڈاکٹر شاداب احسانی، ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی، پروفیسر سحر انصاری اور شمع افروز شامل تھیں۔ اختر سعیدی اور ظفر اقبال نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ تقریب میں اختر شیرانی کی پوتی صبا نے بھی خصوصی طور پر شرکت کی۔ پروفیسر یونس حسنی نے مزید کہا کہ ان کی غزلوں میں گداز ہے۔ تقریب کے صدر مسعود احمد برکاتی نے کہا کہ اختر شیرانی کے یہاں اعلیٰ تہذیبی اقدار اور رکھ رکھاؤ نمایاں ہے۔ ان کی شاعری میں بھی اپنے عہد کی تہذیبی عکاسی ہے۔ ڈاکٹر شاداب احسانی نے اپنے مقالے بعنوان ''اختر شیرانی اور جدید ادب'' میں کہا کہ اختر شیرانی کا عہد بیسویں صدی کا اولیٰ ہے ان کی شاعری میں تخیل اولیٰ نمایاں ہے ان کی شاعری رومانوی اور انقلابی ہے اس میں نغمگی بھی ہے۔ ان کے اظہار میں جمال تھا، ن م راشد اور احمد ندیم قاسمی ان کے شاگردوں میں تھے۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

شان الحق حقی اردو کا گراں قدر سرمایہ تھے۔ زہرہ نگاہ

ممتاز شاعرہ زہرہ نگاہ نے کہا ہے کہ شان الحق حقی اردو کا گراں قدر سرمایہ تھے۔ شاعری اور نثر میں انھیں کمال عبور حاصل تھا۔ اردو ادب کی ان کی خدمات اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ بات انھوں نے یہاں آرٹس کونسل کراچی کے زیر اہتمام تقریب کمال اعتراف میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے کہی۔ جس کا اہتمام ان کی برسی کے حوالے سے کیا گیا تھا۔ اس موقعے پر پروفیسر سحر انصاری، فاطمہ ثریا بجیا، سیکرٹری آرٹس کونسل احمد شاہ، مسعود برکاتی، محمد احمد سبزواری، شایان الحق حقی اور ڈاکٹر فاطمہ حسن نے بھی خطاب کیا۔ ڈاکٹر فاطمہ حسن

نے کہا کہ شان الحق حقی کو ہمہ جہت کہنا محض رسمی بات ہے، وہ بیک وقت شاعری، افسانہ نگاری، طنز و مزاح، لغت نویسی اور تحقیق سے وابستہ رہے۔ پروفیسر سحر انصاری نے کہا کہ حقی علم و ادب میں ڈوبے ہوئے انسان تھے، وہ ہمہ وقت اپنی ذات سے غیر معمولی صلاحیتیں اجاگر کیا کرتے تھے، وہ ایک بہترین مترجم تھے۔ انھوں نے ڈرامہ نگار شیکسپیئر کے ڈراموں کا بھی ترجمہ کیا۔ جب تک اردو کی بہاریں ہیں شان الحق حقی کا نام زندہ رہے گا۔ مسعود احمد برکاتی نے کہا کہ شان الحق نے بچوں کے لیے بے مثال اور قابل قدر تخلیقات پیش کیں۔ آرٹس کونسل کے اعزازی سیکرٹری محمد احمد شاہ نے کہا شان الحق حقی بلاشبہ ہمارے عہد کا بڑا نام ہے۔ جنھوں نے اردو ادب کے لیے بے مثل کام کیا جو آئندہ نسلوں کے لیے بھی آگہی اور رہنمائی کا ذریعہ ہے۔ فاطمہ ثریا بجیا نے بھی شان الحق حقی کو خراج تحسین پیش کیا۔ شایان الحق حقی نے کہا کہ حقی صاحب کو میزبانی اور باغبانی کا بہت شوق تھا۔ میں نے زندگی میں تو انھیں نہیں پڑھا لیکن اب اندازہ ہوتا ہے کہ اردو ادب کے لیے ان کا بہت کام ہے۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

مجموعہ کلام ''اور ایک سچ'' کی تقریب

ممتاز بزرگ شاعر راغب مرادآبادی نے کہا ہے کہ ''ادب'' تہذیبی اقدار و روایات کا امین ہے۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے آرٹس کونسل میں ''کین لٹریری کونسل'' کی جانب سے معروف شاعرہ شاہدہ اسرار کنول کے مجموعہ کلام ''اور ایک سچ'' کی تعارفی تقریب کے موقعے پر اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ کنول نے اپنے اردگرد کے ماحول کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، امید ہے کہ وہ مستقبل میں نمایاں مقام حاصل کریں گی۔ مہمان خصوصی، صوبائی وزیر (سندھ) خالد بن ولایت نے کہا کہ شاہدہ اسرار کنول کی شاعری میں سماجی اور معاشرتی زندگی کا عکس دیکھا جاسکتا ہے اور ان کی شاعری میں موجودہ حالات کی بھی عکاسی ہے۔ مہمان اعزازی ممتاز ڈراما نگار فاطمہ ثریا بجیا نے کہا کہ آج کے دور میں سچ بولنا بہت مشکل ہے لیکن یہ فریضہ شاہدہ اسرار کنول نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ جو ہمیشہ لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ شاہدہ کی شاعری متاثر کن ہے۔ قبل ازیں معروف شاعر خورشید اقبال حیدر نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر جاوید منظر، ارشد حسین، پروفیسر علی حیدر ملک اور پروفیسر ساجدہ سلیم نے بھی شاہدہ اسرار کنول کے فن اور شخصیت کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

گواہی میرے عہد کی شائع ہوگئی

ممتاز شاعر اور نقاد پروفیسر جاذب قریشی کے فن اور شخصیت کے حوالے سے مضامین کا مجموعہ ''گواہی میرے عہد کی'' شائع ہوگیا جو ۴۰۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۶۲ انگریزی صفحات اس کے علاوہ ہیں۔ یہ کتاب رخسانہ صبا اور لبنیٰ منظر نے مرتب کی ہے۔ جاذب قریشی ۵۵ برس سے تخلیقی و ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

اطہر اقبال کی کتاب ''مسافر حرم کا'' شائع ہوگئی

بچوں کی مقبول کتاب ''ایک کہاوت ایک کہانی'' کے مصنف اطہر اقبال کی نئی کتاب ''مسافر حرم کا'' فرید پبلشرز اردو بازار کراچی کے زیر اہتمام شائع ہوگئی ہے جس میں مصنف نے گزشتہ سال کیے جانے والے اپنے حج کے پس منظر کے حوالے سے احساسات و مشاہدات کو آسان الفاظ میں تاریخی حوالوں کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

مثنوی ''زوال آدم'' شائع ہوگئی

اکادمی بازیافت کراچی کے زیر اہتمام ممتاز بزرگ شاعر عقیل احمد فضا اعظمی کی تازہ کتاب ''مثنوی زوال آدم'' منظر عام پر آ گئی۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

قمر علی عباسی کا سفرنامہ شائع ہوگیا

معروف کالم نگار اور سفرنامہ نگار قمر علی عباسی کا نیا سفرنامہ ''عمان کے مہمان'' شائع ہوگیا ہے۔ یہ قمر علی عباسی کا اٹھائیسواں سفرنامہ ہے۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

شعری مجموعہ ''سردست'' شائع ہوگیا

جواں فکر شاعر، سلمان صدیقی کا پہلا شعری مجموعہ ''سردست'' شائع ہوگیا جوان کی غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں سلمان صدیقی کی شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر سحر انصاری، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر انور سدید، احمد ہمیش اور رؤف نیازی کے مضامین شامل ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

انور شعور کی کتاب ''می رقصم'' کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوگیا

انور شعور کی غزلوں کے دوسرے مجموعے ''می رقصم'' کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوگیا ہے۔ اس کا پیش لفظ مشفق خواجہ نے لکھا ہوا ہے نیز احمد ندیم قاسمی، قمر جمیل، محمود واجد، احمد جاوید اور ڈاکٹر فاطمہ حسن کے تاثرات شامل ہیں۔ ''می رقصم'' کو اکیڈمی ادبیات پاکستان کی

طرف سے علامہ اقبال ایوارڈ اور گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد خان کی طرف سے بھی ایوارڈ مل چکا ہے اس سے پہلے انور شعور کے دو مجموعے ''اندوختہ اور مشق سخن'' شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکے ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

حمیدی چلڈرن لٹریچر پروموشن فاؤنڈیشن کی تقریب

حمیدی چلڈرن لٹریچر پروموشن فاؤنڈیشن کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی نے امر پر زور دیا کہ ملک سے محبت اور اخلاقی روایات کو فروغ دینے والے احساسات کو بچوں کی کہانیوں کا موضوع بنانے کی ضرورت ہے اجلاس میں جناب مسعود احمد برکاتی سمیت بچوں کے ادب لکھنے والے اہم ادیب موجود تھے۔ جناب مسعود احمد برکاتی نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ بچوں کے لیے لکھنے والے ادیبوں کی سرپرستی کرے اور انھیں انعامات سے نوازے۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

جرمن مصنفہ نوبل انعام جیت گئیں

جرمن مصنفہ ہرٹہ مولکر نے لٹریچر کے شعبے میں نوبل انعام جیت لیا، تفصیلات کے مطابق ۵۶ سالہ جرمن مصنفہ کو رومانیہ میں آمریت کے خلاف کام اور آواز بلند کرنے پر نوبل انعام دینے کا اعلان کیا گیا، ہرٹہ مولکر رومانیہ میں پیدا ہوئیں بعدازاں ۱۹۸۷ء میں وہ ۳۶ سال کی عمر میں جرمنی منتقل ہو گئیں، انھیں ۱۹۷۰ء میں آمر حکومت کے حق میں لکھنے سے انکار پر پہلی ملازمت سے جواب دے دیا گیا تھا جس کے بعد انھوں نے رومانیہ میں جمہوریت کی بحالی کے لیے طویل جدوجہد کی۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

ذکرِ رسولؐ انام کی اشاعت

معروف شاعر انور کیف کا نعتیہ مجموعہ ''ذکر رسول انام'' شائع ہو گیا۔ کتاب میں پروفیسر سحر انصاری، سرور جاوید، ڈاکٹر شاداب احسانی، شاہد حمید، ایم آئی ارشد اور دیگر حضرات کی آراء شامل ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

''بجھتے سورج نے کہا'' شائع ہو گیا

ممتاز شاعر شاعر صدیقی کا دوسرا مجموعہ غزل ''بجھتے سورج نے کہا'' شائع ہو گیا ہے، جس میں ان کی نظمیں، غزلیں اور قطعات شامل ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

قرض ہنر کی اشاعت

جدہ میں مقیم ملتان کے ممتاز شاعر محمد مختار علی کا مجموعہ کلام ''قرضِ ہنر'' شائع ہوگیا۔ جس میں ڈاکٹر انور سدید، محمد اظہار الحق، ڈاکٹر وزیر آغا اور دیگر اہل قلم کے مضامین شامل ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

معروف شاعر ساجد علی ساجد انتقال کر گئے

معروف شاعر ساجد علی ساجد ۸/اکتوبر ۲۰۰۹ء کو طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے، ان کی عمر ۶۰ برس تھی، انھوں نے بیوہ کے علاوہ تین بیٹوں اور ایک بیٹی کو سوگوار چھوڑا ہے۔ ساجد علی ساجد بچپن ہی میں دونوں ہاتھوں سے محروم ہو گئے تھے لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور انتہائی حوصلے اور عزم کے ساتھ پوری زندگی گزاری۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

نسیم انصاری کے اعزاز میں تقریبِ پذیرائی

بھارت کے معروف شاعر نسیم انصاری نے کہا ہے کہ ادب سرحدوں کا محتاج نہیں، ادب ایک خوشبو ہے جسے قید نہیں کیا جاسکتا۔ ان خیالات کا اظہار انھوں محبان بھوپال فوم کی جانب سے اپنے اعزاز میں منعقدہ تقریب کے موقعے پر کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں جب بھی بھوپال سے کراچی آتا ہوں تو اپنے ساتھ محبتوں کے تحفے لے جاتا ہوں۔ انھوں نے میزبان شگفتہ فرحت کا بطور خاص شکریہ ادا کیا اور اپنی نظمیں اور غزلیں بھی سنائیں۔ صدر تقریب ممتاز شاعرہ ریحانہ روحی نے کہا کہ نسیم انصاری مشاعروں کے اہم شاعر مانے جاتے ہیں۔ دراصل یہ نظم کے شاعر ہیں۔ اچھے نظامت کار اور کالم نگار بھی ہیں۔ پاکستان اور بھارت کے ثقافتی، ادبی اور سماجی سلسلوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کے تبادلوں سے باہمی رنجشوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ قبل ازیں فورم کی چیئر پرسن شگفتہ فرحت نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ اس موقعے پر ریحانہ روحی، نسیم انصاری، کامی شاہ، ظفر بھوپالی، گل افشاں اور ندیم سبطین نے اپنا کلام بھی سنایا۔ اس تقریب میں جن اہم شخصیات نے شرکت کی ان میں سیف الرحمان گرامی، انوار احمد خان، اویس ادیب انصاری، ظفر رامے، سلیم بھوپالی، مسعود الحسن، وقار زاہدی، نثار علی اور شائستہ فرحت شامل ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

ڈاکٹر وحید قریشی انتقال کر گئے

۱۷/اکتوبر ۲۰۰۹ء بروز ہفتہ ڈاکٹر وحید قریشی لاہور میں انتقال کر گئے۔ وہ ایک عرصے سے صاحبِ فراش تھے۔ لیکن وہ آخری

سانس تک لکھنے پڑھنے اور تدریس میں مشغول رہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نامور محقق اور نقاد تھے۔ انھوں نے شاعر بھی کی۔ ان کا ڈی لٹ کا موضوع ''میر حسن اور ان کا عہد'' تھا۔ انھوں نے چوبیس کتابیں تصنیف کیں وہ تقریباً پچیس کتابوں کے مرتب بھی تھے۔ وہ کئی ادبی رسائل سے متعلق رہے جن میں ''صحیفہ'' بھی شامل ہے۔ وہ مغربی پاکستان اردو اکادمی کے سربراہ تھے جس نے کئی قابلِ ذکر کتابیں شائع کیں۔ آج کل وہ ''مخزن'' کے مدیر تھے جو ان کی علالت کے باوجود وقت پر شائع ہوتا رہا ہے۔ ڈاکٹر رشید حسن خان، امتیاز علی عرشی، مشفق خواجہ جیسے محققین کے بعد ڈاکٹر وحید قریشی کے انتقال نے ادبی دنیا کو سوگوار کر دیا ہے۔

(ادارہ)

''سرورق کی لڑکی'' کی تقریبِ اجرائی

کالم نگار اور افسانہ نویس ظفر محی الدین کے افسانوں کی کتاب ''سرورق کی لڑکی'' کی تقریبِ اجرائی دائرہ ادب و ثقافت اور ڈھاکہ گروپ آپ انسٹی ٹیوشنز اور بزم کہکشاں کے زیرِ اہتمام انجام پائی جس کے صدر افسانہ نگار اور نقاد پروفیسر علی حیدر ملک تھے۔ نظامت کے فرائض پروفیسر اظفر رضوی نے انجام دیے۔ مقررین میں شہناز پروین، شفیق احمد شفیق، عشرت رومانی، صابر نظامی، ابوبکر شیخانی، دوست محمد فیضی شامل تھے۔ اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر علی حیدر ملک نے افسانوں کی کتاب کی اشاعت اور تقریب اجرائی کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ عام طور پر شعری مجموعوں کی بھرمار ہے اور تیسرے درجے کے شعرا سے لوگ واقف ہوتے ہیں جب کہ نثر کی بڑی اہمیت ہے۔ انھوں نے ظفر محی الدین کو ان کے افسانوں مجموعے پر اشاعت پر مبارک باد دی اور کہا کہ افسانہ نگار زیادہ تر حکومت کے زیرِ عتاب رہے ہیں۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مختلف حکومتوں نے انقلابی قسم کے شعرا کو بھی نہیں بخشا ہے جن میں حبیب جالب، فیض، شورش کاشمیری اور شامل ہیں۔ نیز دوسری زبانوں کے شعرا کو بھی نہیں بخشا گیا ہے۔ ادبی تاریخ اس کی گواہ ہے۔ آخیر میں پروفیسر علی حیدر ملک نے ظفر محی الدین کو مشورہ دیا کہ وہ افسانے لکھتے رہیں۔

(ادارہ)

''سرِدست'' کی تقریبِ اجراء

معروف شاعر سلمان صدیقی کے تازہ شعری مجموعہ ''سرِدست'' کی تقریب اجراء ۱۱/اکتوبر ۲۰۰۹ء کو آرٹس کونسل آف پاکستان کی اسپیشل ایونٹس کمیٹی کے زیر اہتمام منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر سحر انصاری نے کی، مہمان خصوصی کراچی یونی ورسٹی کے رجسٹرار پروفیسر رئیس علوی تھے جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر اقبال پیرزادہ نے انجام دیے۔ اتوار ہونے کے باوجود ایک کثیر تعداد تقریب میں موجود تھی۔ جو کہ آجکل کے حالات میں غیر معمولی بات ہے۔

تقریب سے خطاب کرتے ہوئے صدر محفل سحر انصاری نے کہا کہ سلمان ایک شائستہ اور ذمے دار انسان ہیں ان کی نئی زمینوں میں لکھی گئی غزلیں اور مختصر نظمیں ان کے مزاج کی مکمل نمائندگی کرتی ہیں ان کا طرز احساس اپنا ہے جسے ادبی حلقوں میں خاص طور سے پسند کیا جاتا ہے وہ ادبی روایات کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔

مہمان خصوصی پروفیسر رئیس علوی نے کہا کہ میں سلمان کو تب سے جانتا ہوں یہ جب یہ طالب علم تھے، یہ ہمیشہ سے بہت مہذب اور منکسر المزاج ہیں۔ ان کی شاعری میں پوری زندگی بولتی ہے ان کے اشعار ضرب المثل بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری ان کے ذاتی اوصاف کی نمائندگی کرتی ہے۔

پروفیسر جاذب قریشی نے اپنے مضمون میں کہا کہ سلمان شعر لکھ رہا ہے، تنقید لکھ رہا ہے، گفتگو کر رہا ہے، اور ادبی نشستیں پابندی سے منعقد کر رہا ہے۔ ان کی شاعری میں پوری زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ عباس رضوی نے سلمان صدیقی کی شاعری کو ماں کی محبت اور زندگی کے انتہائی لطیف جذبوں کی انتہائی متاثر کن تصویر کشی قرار دیا۔ سرور جاوید نے کہا کہ سلمان بہت تیزی سے شعری منظرنامے میں اپنی جگہ بنا رہے ہیں۔ میں انھیں اصل مبارک باد ان کے دوسرے شعری مجموعے کی اشاعت پر دوں گا۔ عنبرین حسیب عنبر نے سلمان صدیقی کی شاعری کو عصری حسیت کی شاعری قرار دیا اور اس کی اثر پذیری کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ حمیرا راحت نے کہا کہ میں جس سلمان صدیقی کو جانتی ہوں ان کی شاعری میں اس سے مختلف ایک سلمان صدیقی سے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ ایک بہت اچھا شعری مجموعہ ہے محترمہ حجاب عباسی نے ایک خوبصورت منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

(رپورٹ: یامین اختر)

عبداللہ جان جمال دینی کمالِ فن ایوارڈ ۲۰۰۸ء کے لیے منتخب

اکادمی ادبیات (پاکستان) کی طرف سے کمالِ فن ایوارڈ ۲۰۰۸ء بلوچستان کے ادیب و دانشور جناب عبداللہ جان جمال دینی کو دیا گیا ہے۔ اکادمی ادبیات کی جانب سے کمالِ فن ایوارڈ پہلی بار کسی ادیب کو دیا گیا ہے۔ اکادمی ادبیات کے چیرمین جناب فخر الزماں نے عبداللہ جان جمال دینی کو اس ایوارڈ کے ملنے پر مبارک باد پیش کی ہے۔ ملک بھر کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی ان کو اس ایوارڈ کے ملنے پر مسرت کا اظہار کیا ہے۔ ان کی کتابوں میں ''لٹ خانہ''، ''مرگ وینا''، ''لینن کی کتاب'' اور ''بلوچستان میں سرداری قبائلی نظام کا سیاسی پس منظر'' شامل ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

رفیق احمد نقش ☆

نئے خزانے

اِس اشاریے کی تیاری میں درجِ ذیل جرائد سے مدد لی گئی ہے:

جریدہ	پتا	ای میل
آئندہ	۳، اقبال منزل، کیمبل روڈ (نزد برنس روڈ)، کراچی ۷۴۲۰۰	
احوال و آثار	حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، مولویانِ کاندھلہ، ضلع مظفر نگر، (یوپی، ہند) ۲۴۷۷۷۵	
اخبارِ اردو	مقتدرۂ قومی زبان، پطرس بخاری روڈ، ایچ ۸/۴، اسلام آباد	nlapak@apollo.net.pk
ادبِ لطیف	۳۹۔ گرین ایکرز، رائے ونڈ روڈ، لاہور ۵۳۷۰۰	adabelatif@hotmail.com
ادبیات	ایچ ۸/۱، اسلام آباد	academy@apollo.net.pk
ارتقا	ارتقا مطبوعات، اے ۱۰، ولایت آباد نمبر ۲، منگھو پیر روڈ، کراچی ۷۵۷۰۰	irtiqa2000@yahoo.com
اردو	انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشنِ اقبال، کراچی	
اردو ادب	انجمنِ ترقیِ اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی، انڈیا	anjuman.urdughar@gmail.com
اردو ڈائجسٹ	۲۱۔۱۹، ایکڑ اسکیم، سمن آباد، لاہور	info@urdudigest.com.pk
اردو بک ریویو	۱۷۳۹/۳، (ذیلی منزل)، نیو کوہِ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲، انڈیا	arifiqbalubr@yahoo.co.in
ارمغانِ حمد	نوشین سینٹر، دوسری منزل، کمرا نمبر ۱۹، اردو بازار، کراچی	tahirsultani@gmail.com
اشراق	المورد، ۵۱ر کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور	ishraq@ghamidi.org
اقبال	نرسنگ داس گارڈنز، ۲ر کلب روڈ، لاہور	
اقبالیات	اقبال اکادمی پاکستان، چھٹی منزل، اکادمی بلاک، ایوانِ اقبال، ایجرٹن روڈ، لاہور	director@iap.gov.pk
الاقربا	الاقربا فاؤنڈیشن، مکان نمبر ۱۴۶۴، اسٹریٹ نمبر ۵۸، آئی ۳/۸، اسلام آباد	al-aqreba@hotmail.com
الحق	اکوڑہ خٹک، دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک، ضلع نوشہرہ (سرحد) پاکستان	editor_alhaq@yahoo.com
الزبیر	اردو اکیڈمی، ۳۳ر سی، ماڈل ٹاؤن، اے، بہاول پور	

☆ مکان نمبر اے ستاسی، بلاک این، نارتھ ناظم آباد، کراچی ۷۴۷۰۰

السیرۃ عالمی	زوّار اکیڈمی، پبلی کیشنز، اے۔۴/۱۷، ناظم آباد نمبر۴، کراچی ۷۴۶۰۰	sarahman@rahet.org
الشریعہ	الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجراں والا	
الماس	شعبۂ اردو، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیرپور، سندھ	yousufkhushk@yahoo.com
انشا	۲۵/بی، زکریا اسٹریٹ، کولکتا ۷۰۰۰۷۳، انڈیا	inshapublications@yahoo.co.in
انشا	۴۲۹/سی، یونٹ نمبر۱۰، لطیف آباد، حیدرآباد (سندھ)	
بادبان	ای۲، ۱۴/۸، معمار اسکوائر، بلاک ۱۴، گلشنِ اقبال، کراچی	badbaanurdu@yahoo.com
بازیافت	شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور	
پرواز	پوسٹ بکس نمبر ۱۷۶۶۷، کراچی ۷۵۳۰۰	maerajami@yahoo.co.uk
پہچان	تاج چیمبرز، نیوٹاؤن، میرپور خاص ۶۹۰۰۰	pehchan.mirpurkhas@gmail.com
تجدیدِ نو	۶۹۵/الف، جوہر ٹاؤن، لاہور	tajdeedenau@yahoo.com
تحقیق	شعبۂ اردو، آرٹس فیکلٹی، سندھ یونیورسٹی، جام شورو ۷۶۰۸۰ (سندھ)	urdu_sindhu@yahoo.com
ترجمان القرآن	منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۷۹۰	tarjumanq@wol.net.pk
تعمیرِ افکار	زوّار اکیڈمی پبلی کیشنز، اے۴/۱۷، ناظم آباد، کراچی ۷۴۷۰۰	syed.azizurrahman@gmail.com
جامعہ	ذاکر حسین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعۂ ملّیۂ اسلامیہ، نئی دہلی، انڈیا	
جرنل آف ریسرچ (اردو)	فیکلٹی آف لینگویجز اینڈ اسلامک اسٹڈیز، بہاء الدّین زکریا یونیورسٹی، ملتان	
جوش بانی	۶۸، مرزا غالب روڈ، الہ آباد، انڈیا	
جوش شناسی	بی اے/۱۱۶، امروہہ سوسائٹی، سیکٹر اے ۳۷، اسکیم ۳۳، گل زار ہجری، کراچی ۷۵۲۹۰	
خدا بخش لائبریری جرنل	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، انڈیا	
چہارسُو	۵۳۷، ویسٹریج۔III، راول پنڈی	waqars_oma@yahoo.com
دریافت	نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد	numl_urdu@yahoo.com
دنیازاد	بی ۱۵۵، بلاک ۵، گلشنِ اقبال، کراچی	asiffarrukhi@hotmail.com
روشنائی	اے۔۸، ندیم کارنر، بلاک این، نارتھ ناظم آباد، بالمقابل ڈی سی سینٹرل آفس، کراچی ۷۴۷۰۰	quarterlyroshnai@hotmail.com
زبان وادب	شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، فیصل آباد	urdu@geuf.edu.pk
سبقِ اردو	گوپی گنج ۲۲۱۳۰۳، بھدوہی، انڈیا	sabaqeurdu@yahoo.com
سخن	شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور	
سخن زار	روحا پبلیکیشنز، بنگلہ نمبر ایف ایل ۱۲/۳، بلاک ۵، مین راشد منہاس روڈ، گلشنِ اقبال، کراچی	
سخن وَر	پوسٹ بکس نمبر ۱۷۸۳۰، ہیڈ پوسٹ آفس گلشنِ اقبال، کراچی	masoomsukhan@hotmail.com
سفیرِ اردو	ڈی۔۱۲، منیبہ آرکیڈ، گلستانِ جوہر بلاک ۷، مین یونیورسٹی روڈ، کراچی ۷۵۲۹۰	maerajami@yahoo.co.uk

سمبل	رانی مارکیٹ، ٹینچ بھاٹا، راول پنڈی کینٹ	
سورج	۲/۱۲، میاں چیمبرز، ۳، ٹمپل روڈ، لاہور	surajquarterly@yahoo.com
سویرا	قوسین، ۱۵۔ سرکلر روڈ، اردو بازار، لاہور	qausain60@hotmail.com
سیارہ	کمرا نمبر ۵، پہلی منزل، نور چیمبرز، بنگالی گلی، گنپت روڈ، لاہور	
شاعر	پوسٹ بکس نمبر ۳۷۷۰، گرگام پوسٹ آفس، بمبئی ۴۰۰۰۰۴، انڈیا	
عالمی اردو ادب	ایف ۱۴/۲۱ (ڈی)، کرشن نگر، دہلی ۱۱۰۰۵۱، انڈیا	nandkishorevikram@yahoo.co.in
عکاس	مکان نمبر ۱۱۶۴، گلی نمبر ۲، بلاک سی، نیشنل پولیس فاؤنڈیشن، پوسٹ آفس کورنگ ٹاؤن، لوہی بھیر، اسلام آباد	akkasurdu@hotmail.com
فرائیڈے اسپیشل	سیّد ہاؤس، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی ۷۴۲۰۰	fridayspecial@hotmail.com
فکر نو	۷۶ سی، جوڈیشل کالونی، فیز II، لالہ زار، راے ونڈ روڈ، لاہور	
فکر و تحقیق	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک ۱، ونگ ۶، آر کے پورم، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶، انڈیا	
فکر و نظر	ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، پوسٹ بکس نمبر ۱۰۳۵، اسلام آباد	
قومی زبان	انجمنِ ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشنِ اقبال، کراچی	qaumi.zaban@yahoo.com
کتاب	۶، ماؤ ایریا، جی ۸/۴، تعلیمی چوک، اسلام آباد	books@nbf.org.pk
کتاب نما	مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵، انڈیا	manthlykitabnuma@yahoo.com
لوحِ ادب	بزمِ صادق، ۲۱/اے، لطیف آباد نمبر ۱۱، حیدر آباد	lauhe_adab@yahoo.com
مادرا	فرید ٹاور ۱۹، ٹمپل روڈ، لاہور	mavrabooks@yahoo.com
ماہِ نو	۲۱۸/۱۴، شاہد کالونی، وحدت روڈ، لاہور	
مجلۂ عثمانیہ	محبوبیہ لٹریسی سینٹر، ۱۴۹، بلاک ۳، بہادر آباد، کراچی	
مزدور جدّوجہد	صوفی مینشن ۷، ایجرٹن روڈ، لاہور	talkmj@yahoo.com
معارفِ اسلامیہ	(اردو، عربی، انگریزی) کلیۂ معارفِ اسلامیہ، جامعہ کراچی، کراچی	
معارف	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (یوپی) ۲۷۶۰۰۱، انڈیا	shibli_academy@rediffmail.com
معارفِ رضا	۲۵/ جاپان مینشن، رضا چوک، (ریگل) صدر، کراچی	imamahmadraza@gmail.com
مونتاج	۳/۲، ٹمپل روڈ، لاہور	montaj_lhr@hotmail.com
نقاط	بی ۲۴۰، رحمان اسٹریٹ، سعید کالونی، مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد	niqaat@gmail.com
نگار پاکستان	سی ۲۸، بلاک ۱۳/ڈی، گلشنِ اقبال، کراچی	
نیا ورق	۳۶/۳۸، عمر کھادی، کوس لین، ممبئی ۴۰۰۰۰۹، انڈیا	nayawaraq@yahoo.com
وجدان	۲۲۷، نشتر بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور	wijdan@hotmail.com

یہ اشاریہ جنوری ۲۰۰۸ء سے دسمبر ۲۰۰۸ء کے دوران شائع ہونے والے جرائد میں شائع شدہ تحریروں پر مبنی ہے۔

اشاریہ مصنفین کے ناموں کی الف بائی ترتیب سے درج ذیل موضوعات پر مشتمل ہے:

- آپ بیتیاں/ یادداشتیں
- آزاد، ابوالکلام
- آنند، ستیہ پال
- ابلاغِ عامہ
- اختر الایمان
- ادارے
- اردو
- اسد محمد خاں
- اسلام/ تاریخ
- اسلام/ حدود وتعزیرات
- اسلام/ عقائد وعبادات
- اسلام/ متفرقات
- اسلام/ مسائل وتفقہ
- اسلام/ معاشرت ومعاملات
- اشاریے+ کتابیات
- اصغر ویلوری
- اصنافِ ادب/ آپ بیتی
- اصنافِ ادب/ افسانہ
- اصنافِ ادب/ افورسم
- اصنافِ ادب/ انشائیہ
- اصنافِ ادب/ تاریخ گوئی
- اصنافِ ادب/ تپائی
- اصنافِ ادب/ تحقیق
- اصنافِ ادب/ تذکرہ
- اصنافِ ادب/ تنقید
- اصنافِ ادب/ حمد
- اصنافِ ادب/ دیباچہ
- اصنافِ ادب/ ڈراما
- اصنافِ ادب/ رباعی
- اصنافِ ادب/ ریختی
- اصنافِ ادب/ سیرت
- اصنافِ ادب/ غزل
- اصنافِ ادب/ ناول
- اصنافِ ادب/ نثری نظم
- اصنافِ ادب/ نظم
- اصنافِ ادب/ نعت
- اصنافِ ادب/ ہائیکو
- اطلاعیات
- افتخار جالب
- اقبالیات
- انبیائے کرامؑ
- انتظار حسین
- ایجادات
- آثارِ قدیمہ
- بچوں کا ادب
- بلراج کومل
- بنگالی زبان وادب
- بورخیس، خورخے لوئیس
- بین المذاہب
- بینکاری
- بے نظیر بھٹو
- پروین شاکر
- پریم چند
- پنجابی زبان وادب
- تاریخ وسیاست
- تاریخِ ادب
- تبصرہ وتعارف
- تجزیاتی مطالعے
- تجزیے
- تحریر شناسی
- تحریکات ونظریات
- تحقیق وتنقید
- تربیت+ نظم وضبط
- ترجمہ: تحقیق ومسائل
- تصوف
- تعارف وتبصرۂ کتب وجرائد
- تعلیم وتدریس
- تعمیرات
- تقابلی مطالعات
- تہذیب وثقافت
- تہوار
- جاپان
- جاوید صدیق بھٹی
- جشنِ جامعہ پنجاب
- جلال الدین قادری رضوی
- جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء
- جوش ملیح آبادی
- جوہر، حفیظ
- حالاتِ حاضرہ
- حالی، خواجہ الطاف حسین
- حبسیات
- حدیث وسنت
- حسرت موہانی
- حسن بیگ
- حسن منظر
- حیوانیات
- خاطر غزنوی
- خاکے
- خالد یوسف
- خسرو، امیر
- خطبات
- خطوط
- خطاطی
- خلیق انجم، ڈاکٹر
- خواتین/ تانیثیت

درویش، محمود
رثائی ادب
ردِعمل
رسائل و جرائد
رسل، رالف
رشید حسن خاں
رضویات
رفیق عزیزی، سیّد محمد
روسی زبان و ادب
رومی، مولانا جلال الدّین
زبانیں
زراعت
زوّار حسین شاہ، مولانا سیّد
ساجد، اسحاق
ساحر شیوی
ساحل، ذی شان
سائنس
سفرنامے
سندھی زبان و ادب
سنسکرت زبان و ادب
سیرت النبی ﷺ
سیّد احمد خاں، سر
شاد عظیم آبادی
شان الحق حقی
شاہ ولی اللہ
شبلی نعمانی
شخصیات
شعریات
شکیل دسنوی
شمسہ مسعود
شمیم، رفعت
صابر کلوروی، ڈاکٹر
صحابۂ کرام
صفیہ صدّیقی
ضیاء الدّین اصلاحی
طارق محمود، خواجہ
طبّ و صحت
طنز و مزاح
ظفر، بہادر شاہ
عالم، افروز
عبدالحق، بابائے اردو مولوی
عبدالحمید سواتی، صوفی
عدیم، طاہر
عربی زبان و ادب
عروض
عزیز احمد
عمرانیات
غالبیات
غامدی، جاوید احمد
فارسی زبان و ادب
فراز، احمد
فلسفہ
فنونِ لطیفہ
فیروز عالم
فیض، فیض احمد
قائداعظم
قرۃ العین حیدر
قرآنیات
قواعد
کتب خانے
کرشن چندر
کشفی، ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر
کشمیر
کشمیری زبان و ادب
کمپیوٹر سائنس
کھیل
گل جی
گیان چند جین
لسانیات
لغات
لمعہ حیدرآبادی، عبّاس علی خاں
ماحولیات
مجید امجد
مخدوم محی الدّین
مخطوطات
مذہب، رحمان
مسعود، احمد
مسعود احمد، پروفیسر ڈاکٹر محمد
مسلم اقلیتیں
مشفق خواجہ
مصاحبے
مطالعۂ پاکستان
معرکے
معلومات
مغربی ادب
مقامات
منیر نیازی
منیر الدّین احمد
موسیقی
میریات
نارنگ، گوپی چند
ناصر کاظمی
نامی انصاری
نباتیات
نتسن، سولزے
ندیم قاسمی، احمد
نسیم، م۔
نفسیات
نفیس رقم، سیّد نفیس الحسینی
نوری، نور جہاں
نیاز فتح پوری
نیپال
نیر مسعود
وجودیت
وحید قریشی، ڈاکٹر
وزیر آغا، ڈاکٹر
وہاب قیصر، ڈاکٹر

❁ ❁ ❁

آپ بیتیاں/ یادداشتیں

آغا جانی کشمیری	سحر ہونے تک [۱۵]	انشا، کولکتا، جنوری۔فروری ۲۰۰۸ء، ص ۳۰
اسد محمد خاں	میں کیوں لکھتا ہوں؟	چہارسُو، راول پنڈی، جنوری۔فروری ۲۰۰۸ء، ص ۶
اسد محمد خاں	''وِدھ ڈیوا اپولوجی''	چہارسُو، راول پنڈی، جنوری۔فروری ۲۰۰۸ء، ص ۴
پروین شاکر	کہانی میری	لوحِ ادب، حیدرآباد، جولائی۔دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۶۱
رشید امجد	تمنا بے تاب	عکاس، اسلام آباد، جون ۲۰۰۸ء، ص ۱۲
شمسہ مسعود	عرضِ حال	پرواز، لندن، اگست ۲۰۰۸ء، ص ۱۹
شمیم، رفعت	آزمودم عقلِ دوراندیش را	پرواز، لندن، مئی ۲۰۰۸ء، ص ۱۷
عبدالغفار عزیز	اونٹ، خالق کی صناعی کا مظہر	ترجمان القرآن، لاہور، اپریل ۲۰۰۸ء، ص ۷۹
فیض، فیض احمد	[مرتب: احمد سلیم] کالا قادر کے وزیر چرواہے کا شاعر بیٹا	مزدور جدّوجہد، لاہور، ۱۴ر فروری ۲۰۰۸ء، ص ۶
قرۃ العین حیدر	فٹ نوٹ	سیارہ، لاہور، سال نامہ ۲۰۰۸ء، ص ۲۲۷
محمود احمد، مفتی محمد [مرتب]	حیاتِ مبارکۂ مفسّرِ قرآن علاّمہ مفتی محمد جلال الدّین قادری رحمۃ اللہ علیہ خود اُن کی تحریر کے آئینے میں	معارفِ رضا، کراچی، اپریل۔مئی ۲۰۰۸ء، ص ۱۱

آزاد، مولانا ابوالکلام

اسلم فرخی	اردو ادب پر آزاد* کے اثرات [*محمد حسین آزاد]	اردو ادب، نئی دہلی، اپریل۔جون ۲۰۰۸ء، ص ۹۱
حقانی میاں قادری، ڈاکٹر حافظ	مولانا ابوالکلام آزاد اور ذوقِ لطیف	تعمیرِ افکار، کراچی، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۴۴
رؤف خیر	مولانا ابوالکلام آزاد	پرواز، لندن، جولائی ۲۰۰۸ء، ص ۳۴
شفقت رضوی، پروفیسر	مولانا ابوالکلام آزاد مسلم لیگ میں	تعمیرِ افکار، کراچی، جولائی ۲۰۰۸ء، ص ۴۲
عبدالحق، پروفیسر	مولانا آزاد کی انقلابی فکر کا تشکیلی دور	معارف، اعظم گڑھ، دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۴۴۸
وہاب قیصر، ڈاکٹر	مولانا آزاد اور سائنسی علوم	انشا، کولکتا، مارچ، اپریل ۲۰۰۸ء، ص ۱۵
وہاب قیصر، ڈاکٹر	مولانا آزاد کی ترجمہ نگاری	انشا، کولکتا، نومبر، دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۴۴

آنند، ستیہ پال

حامدی کاشمیری	ستیہ پال آنند کی نظم نگاری۔ طریقِ کار کا ایک جائزہ	پرواز، لندن، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۳۳
شکیل الرحمان، ڈاکٹر	وسعت، تہ داری اور جمالیاتی انبساط کی شاعری	پرواز، لندن، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۴
ظہیر غازی پوری	ستیہ پال آنند کی نظم۔ ایک جائزہ	پرواز، لندن، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۵
عبداللہ، ڈاکٹر اے	ستیہ پال آنند کی مرگِ پیش آگاہی کی نظمیں	پرواز، لندن، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۳۹
عتیق اللہ، ڈاکٹر	ستیہ پال آنند کا شعری مجموعہ	پرواز، لندن، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۲
فہیم اعظمی، ڈاکٹر	جدیدیت اور اساطیر کی پیوستگی	پرواز، لندن، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۴۹
کومل، بل راج	ستیہ پال آنند کی نظمیں۔ مربوط تناسب اکائیاں	پرواز، لندن، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۳۶
مہر، سلطانہ	ایک قدرِ مشترک ہے ڈاکٹر ستیہ پال آنند اور میرے درمیان	پرواز، لندن، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۴۳
نارنگ، ڈاکٹر گوپی چند	''دستِ برگ'' (اختتامیہ نوٹ)	پرواز، لندن، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۷
ناصر، نصیر احمد	ستیہ پال آنند کی انفرادیت	پرواز، لندن، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۸
نیّر، ناصر عبّاس	نظم ''مسافرت'' کا تجزیہ	پرواز، لندن، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۵۱
وزیر آغا، ڈاکٹر	ستیہ پال آنند کی نظم نگاری	پرواز، لندن، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۸

ابلاغِ عامّہ

پریمانگوداس گپتا [ترجمہ، مسعود صابر]	مغربی بنگال کی سماجی تحریکیں اور چھوٹے جرائد کا کردار	دنیازاد، کراچی، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۹۸
حبیب احمد، ڈاکٹر قاضی	تمل ناڈو کا قدیم ترین اردو روزنامہ ''مسلمان''	اخبارِ اردو، اسلام آباد، فروری ۲۰۰۸ء، ص ۳۶
نغمانہ طاہر، ڈاکٹر سیمی	برِصغیر میں اخبارات کا جنم اور کمپنی کی پالیسیوں پر ایک تازہ نظر	دنیازاد، کراچی، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۹
روبینہ ترین، ڈاکٹر	انقلاب ۱۸۵۷ء اور ہم عصر اردو صحافت	الماس، خیر پور، شمارہ ۱۰، ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۷
شبیہ الحسن، سیّد	زبان و ادب کے فروغ میں میڈیا کا مثبت کردار	ادبِ لطیف، لاہور، فروری ۲۰۰۸ء، ص ۴۲
فیض، فیض احمد	ہم اور آپ [روزنامہ ''امروز'' کا پہلا اداریہ]	مزدور جدّوجہد، لاہور، ۱۴ر فروری ۲۰۰۸ء، ص ۵۷
لطیف احمد، ڈاکٹر	بنگلہ دیش میں اردو صحافت	اخبارِ اردو، اسلام آباد، فروری ۲۰۰۸ء، ص ۳۱
منصور عالم، ڈاکٹر محمد	ایران سوسائٹی کا مجلّہ انڈو ایرانیکا: بنگال میں فارسی صحافت کا ایک سنگِ میل	معارف، اعظم گڑھ، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۶۱

منوّر علی خاں	ہماری تحریکِ آزادی اور صحافت	اردو ڈائجسٹ، لاہور، اگست ۲۰۰۸ء، ص ۱۹۱
ہاشم شیر خاں	اردو کا ایک قدیم رسالہ: سین ٹیفک ٹری ٹیز	سورج، لاہور، جنوری۔ جون ۲۰۰۸ء، ص ۲۴۱
آصف جیلانی	اردو زبان کو مسخ کرنے میں اخبارات کا کردار	دنیازاد، کراچی، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۳۷

اختر الایمان

ثقلین، محمد	آباد خرابے کا نوحہ (اختر الایمان کی نظمیں)	ادبِ لطیف، لاہور، اکتوبر۔ نومبر ۲۰۰۸ء، ص ۸۷
طاہرہ صدیقہ	اختر الایمان کی شاعری کے چند پہلو	ادبِ لطیف، لاہور، اکتوبر۔ نومبر ۲۰۰۸ء، ص ۶۱

اداریے

بابر مشتاق، میر	ریڈ کراس کیسے وجود میں آئی؟	اردو ڈائجسٹ، لاہور، اپریل ۲۰۰۸ء، ص ۱۷۰
ذاکر حسین	جامعۂ ملّیہ کیا ہے؟	جامعہ، نئی دہلی، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۳
شمس الرحمان محسنی	جامعۂ ملّیۂ اسلامیہ۔ علی گڑھ میں	جامعہ، نئی دہلی، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۳
طیب جامعی، محمد	جامعۂ ملّیۂ اسلامیہ۔ قرول باغ میں	جامعہ، نئی دہلی، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۳۳
عبداللہ ولی بخش قادری	جامعۂ ملّیۂ اسلامیہ۔ جامعہ نگر میں	جامعہ، نئی دہلی، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۴۲

اردو

آصف جیلانی	اردو زبان کو مسخ کرنے میں اخبارات کا کردار	دنیازاد، کراچی، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۳۷
ابرار رحمانی	باپو کا آخری خط اور اردو	پرواز، لندن، جون ۲۰۰۸ء، ص ۲۴
اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر	فروغِ اردو، فورٹ ولیم کالج سے ایف سی کالج تک	اخبارِ اردو، اسلام آباد، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۲
اصغر، مولانا مفتی محمد	اردو زبان کی ضرورت و اہمیت اور دینی مدارس کے طلبہ	الشریعہ، گوجراں والا، مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۲۹
اطہر فاروقی	ہندوستان میں اردو آزادی کے بعد	دنیازاد، کراچی، مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۱۴۸
اطہر فاروقی	ہندوستان میں اردو تحریک۔ ہنوز دلّی دور است	اخبارِ اردو، اسلام آباد، اپریل ۲۰۰۸ء، ص ۲۶
اطہر فاروقی	ہندوستان میں اردو تحریک۔ ہنوز دلّی دور است	پرواز، لندن، فروری ۲۰۰۸ء، ص ۴۳
انجم عباسی	جنگِ آزادی میں اردو کا کردار	پرواز، لندن، مئی ۲۰۰۸ء، ص ۴۱

انجم عثمانی، محمد خالد	اردو زبان کا نیا منظر نامہ	اخبارِ اردو، اسلام آباد، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۳۶
انیس چشتی	اردو تحریر کی تدریس (جدید تحقیقات کی روشنی میں)	اخبارِ اردو، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۴۵
تسنیم فاطمہ، ڈاکٹر سیّد	قائدِ اعظم اور اردو ذریعۂ تعلیم	اخبارِ اردو، اسلام آباد، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۳
تشنہ، پروفیسر ایم نذیر احمد	اردو زبان کے حروفِ تہجّی	اخبارِ اردو، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۴۷
حسن الدّین احمد، ڈاکٹر	اردو الفاظ نگاری	اخبارِ اردو، اسلام آباد، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۹۶
حنیف، م۔	اردو کا جنم اور سفر (ایک سرسری جائزہ)	اخبارِ اردو، اسلام آباد، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۵۵
دُرمُش بلگر، ڈاکٹر	اردو زبان کا مستقبل	اخبارِ اردو، اسلام آباد، جون ۲۰۰۸ء، ص ۱۱
رابعہ سرفراز	اردو بطور ذریعۂ تعلیم	اخبارِ اردو، اسلام آباد، جولائی ۲۰۰۸ء، ص ۱۱
روح الامین، سیّد	اردو بانیانِ پاکستان کی نظر میں	قومی زبان، کراچی، اگست ۲۰۰۸ء، ص ۴۶
رہبر داؤد	بنام صدرِ انجمن	قومی زبان، کراچی، فروری ۲۰۰۸ء، ص ۲۱۳
ریاض احمد	برِ صغیر میں اردو فاصلاتی تعلیم کا دائرۂ کار	اخبارِ اردو، اسلام آباد، جولائی ۲۰۰۸ء، ص ۸
سعید اختر درّانی، ڈاکٹر	اردو پر بیرونی زبانوں کے اثرات	اخبارِ اردو، اسلام آباد، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۵۱
سکندر حیات	دفتری اردو کی ضرورت و اہمیت	قومی زبان، کراچی، جون ۲۰۰۸ء، ص ۵۸
سہیل شیلان	اردو نامہ	اخبارِ اردو، اسلام آباد، اگست ۲۰۰۸ء، ص ۳۷
تقی عابدی، ڈاکٹر سیّد	عالمی اردو کانفرنس، جدّہ ۲۰۰۸ء	اخبارِ اردو، اسلام آباد، اگست ۲۰۰۸ء، ص ۳۰
شفق ہاشمی	اردو ہے جس کا نام...	اخبارِ اردو، اسلام آباد، دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۸
شمس الرحمٰن فاروقی	اردو کی نئی (؟) بستیاں (؟) اور اردو کا پھیلاو	اخبارِ اردو، اسلام آباد، اگست ۲۰۰۸ء، ص ۲۶
شہناز کوثر	زبان ہماری قومی شناخت	قومی زبان، اگست ۲۰۰۸ء، ص ۵۸
صابر ارشاد عثمانی	اردو زبان زیرِ عتاب	پرواز، لندن، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۴
صابر ارشاد عثمانی	اردو کا مہجری ادب۔ توانائی اور تسلسل	پرواز، لندن، فروری ۲۰۰۸ء، ص ۴
صابر ارشاد عثمانی	کیا یہ خوش آئند خبر اردو زبان کے لیے بھی ہے؟	پرواز، لندن، مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۴
صفوان محمد چوہان، ڈاکٹر حافظ+قرۃ العین	اردو مثال گھر (دی بینک آف اردو)	تحقیق، جام شورو، ۲۰۰۸ء، ص ۱۷
طاہر محمد خاں	اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں کا ربطِ باہم	اخبارِ اردو، اسلام آباد، اگست ۲۰۰۸ء، ص ۱
عارف وقار	نئی اردو گرامر کی ضرورت	اخبارِ اردو، اسلام آباد، فروری ۲۰۰۸ء، ص ۴۰

عبدالرشید ترابی	یہ قوم کب تک بے زبان رہے گی؟	اخبارِ اردو، اسلام آباد، مئی ۲۰۰۸ء، ص ۵۰
عبدالغفور، منشی	حامیانِ اردو کی خدمت میں دعوتِ فکر و عمل	پرواز، لندن، نومبر ۲۰۰۸ء، ص ۳۲
عزیز احمد (ہاپوڑ، بھارت)	زبان کا فروغ اور تحفظ	اخبارِ اردو، اسلام آباد، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۵
عطاء اللہ شاہ، سیّد	عہدِ حاضر میں اردو داستان کی تدریس کا جواز	اخبارِ اردو، اسلام آباد، جون ۲۰۰۸ء، ص ۲۳
عطش درّانی، ڈاکٹر	اردو کے سب سے زیادہ مستعمل النّاظ	اخبارِ اردو، اسلام آباد، جون ۲۰۰۸ء، ص ۹
عطش درّانی، ڈاکٹر	اردو میں قرطاسِ تحقیق کی معیاری اسلوبی ہیئت	اخبارِ اردو، اسلام آباد، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۸
عطش درّانی، ڈاکٹر	جدید تدوینِ متن اور اردو اطلاعیات	اخبارِ اردو، اسلام آباد، مئی ۲۰۰۸ء، ص ۲
عقیل، ڈاکٹر معین الدّین	جاپان میں اردو۔ اردو زبان ولسانیات پر تازہ کاوشیں	اخبارِ اردو، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۱۹
علی محمد فرشی	اردو املا۔ اصلاح کی راہ	سمبل، فیصل آباد، جنوری۔ جون ۲۰۰۸ء، ص ۱۱
علی محمد فرشی	املا۔ اصلاح کی راہ	اخبار اردو، اسلام آباد، اگست ۲۰۰۸ء، ص ۲۲
فتح محمد ملک، پروفیسر	اردو اور پاکستان کی دیگر زبانوں کا ربطِ باہم	اخبار اردو، اسلام آباد، مئی ۲۰۰۸ء، ص ۳۳
فرّخ صابری	صفات علوی کے نزدیک 'اردو'۔ ایک دوب گھاس	تجدیدِ نو، اپریل۔ جون ۲۰۰۸ء، ص ۳۷
فیض، فیض احمد	زبان کا مسئلہ	مزدور جدّوجہد۔ لاہور، ۱۴ر فروری ۲۰۰۸ء، ص ۵۳
مجال، خواجہ غلام ربانی	...تو یہ احساں ہوتا	اخبارِ اردو، اسلام آباد، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۹۲
مجال، خواجہ غلام ربانی	حروفِ ہجا کا لسانی سفر اور املا	اخبارِ اردو، اسلام آباد، نومبر ۲۰۰۸ء، ص ۴۲
مجید خان لودھی	اردو کا فنّ و ہنر	اخبارِ اردو، اسلام آباد، دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۳۲
محسن عبّاس	خوشاب میں اردو ادب کی روایت	اخبارِ اردو، اسلام آباد، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۳۳
محیط اسماعیل	محیطیہ صحتِ املا (ہائے ہوز اور ہمزہ بچاؤ تحریک)	اخبارِ اردو، اسلام آباد، اپریل ۲۰۰۸ء، ص ۳۷
مشتاق احمد	اردو: عالمی لسانی تناظر میں	اخبارِ اردو، اسلام آباد، اپریل ۲۰۰۸ء، ص ۱۰
نجم الحسن رضوی	کہانی کی ہجرت [اردو افسانہ نگار دیارِ غیر میں]	اخبارِ اردو، اسلام آباد، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۶
نشتر، محمد اسلام	ڈاکٹر سیّد عبداللہ، بابائے اردو اور تحریکِ پاکستان	اخبارِ اردو، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۲
نیّر، ناصر عبّاس	گلوبلائزیشن اور اردو زبان	اردو ادب، نئی دہلی، جنوری۔ مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۹۳
نعیم حنیف	اردو رسم الخط میں اعراب کا مسئلہ	اخبارِ اردو، اسلام آباد، جولائی ۲۰۰۸ء، ص ۳۶
ارشد اویسی، ڈاکٹر محمد	لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کی کونسل میں اردو کا عمل دخل	زبان و ادب، فیصل آباد، جنوری۔ جون ۲۰۰۸، ص ۸۴

ارشد اویسی، ڈاکٹر محمد	پنجاب لیجیسلیٹو کونسل میں نفاذِ اردو کے اقدامات کا جائزہ	زبان وادب، فیصل آباد، جولائی ـ دسمبر ۲۰۰۸ء، ص۴۷
اطہر، محمد سلمان	اردو قاعدہ اور اردو املا: تحقیقی وتنقیدی جائزہ	زبان وادب، فیصل آباد، جنوری۔ جولائی ۲۰۰۸ء، ص۵۳
الطاف انجم	کشمیر میں علیم کی موجودہ صورتِ حال: اردو کے حوالے سے	شاعر، بمبئی، دسمبر ۲۰۰۸ء، ص۴۳
خلیل احمد بیگ، مرزا	اردو کے آغاز کے نظریے	فکر وتحقیق، اکتوبر ـ دسمبر ۲۰۰۸ء، ص۷
روبینہ ترین، ڈاکٹر+ قیصر امتیاز گورمانی	اردو پر بیرونی فاتحین کی زبانوں کے اثرات	جرنل آف ریسرچ (اردو)، ۲۰۰۸ء، ص۱۷
روح الامین، سیّد	ہماری قومی زبان اردو کی اہمیت	الزبیر، بہاول پور، شمارہ ۲۷، ۲۰۰۸ء، ص۹۹
شمس الرحمان فاروقی	ایرانی فارسی، ہندوستانی فارسی اور اردو مراتب کا قصہ	فکر وتحقیق، نئی دہلی، جولائی ـ ستمبر ۲۰۰۸ء، ص۷
صفوان محمد چوہان، ڈاکٹر حافظ	اردو کارپس، تکنیکی تعارف، اہمیت، ضرورت اور دائرہ ولائحۂ عمل	جرنل آف ریسرچ (اردو)، ۲۰۰۸ء، ص۱۲۱
صفوان محمد چوہان، ڈاکٹر حافظ	ترویجِ اردو کی ایک فوری ضرورت، اردو رسم الخط میں انگریزی۔ اردو لغات کی آن لائن فراہمی	الزبیر، بہاول پور، شمارہ ۲۷، ۲۰۰۸ء، ص۲۷
مجال، خواجہ غلام ربانی	املا، معنی میں بے ربطی	الزبیر، بہاول پور، شمارہ ۲۷، ۲۰۰۸ء، ص۱۸
نجیبہ عارف، ڈاکٹر	قومیت کی تعمیر زبان کی اہمیت	جرنل آف ریسرچ (اردو)، ۲۰۰۸ء، ص۵۳

اسد محمد خاں

اسد محمد خاں	میں کیوں لکھتا ہوں؟	چہارسُو، راول پنڈی، جنوری ـ فروری ۲۰۰۸ء، ص۶
اسد محمد خاں	''وِدھ ڈیوا پولوجی''	چہارسُو، راول پنڈی، جنوری ـ فروری ۲۰۰۸ء، ص۴
عقیلہ اسماعیل [ترجمہ: رضی مجتبیٰ]	جمالیاتی ذوق کا امین [اسد محمد خاں]	چہارسُو، راول پنڈی، جنوری ـ فروری ۲۰۰۸ء، ص۲۳
کشفی، سیّد ابوالخیر	ادب کا آدمی [اسد محمد خاں]	چہارسُو، راول پنڈی، جولائی ـ اگست ۲۰۰۸ء، ص۸۳
گلزار جاوید	براہِ راست [اسد محمد خاں سے گفت گو]	چہارسُو، راول پنڈی، جنوری ـ فروری ۲۰۰۸ء، ص۱۷
مبین مرزا	نئی زمین، نئے آسمان تراشتا ہوں	چہارسُو، راول پنڈی، جنوری ـ فروری ۲۰۰۸ء، ص۲۸
محمد علی صدیقی، ڈاکٹر	اسد محمد خاں کی افسانہ نگاری	ارتقا، کراچی، ۴۵، مارچ ۲۰۰۸ء، ص۲۱۸
مظہر جمیل، سیّد	اسد محمد خاں کا جہانِ فن	چہارسُو، راول پنڈی، جنوری ـ فروری ۲۰۰۸ء، ص۳۸
ندیم قاسمی، احمد	زندگی سے مجھ کو پیار ہے [خطوط بہ نام اسد محمد خاں]	چہارسُو، راول پنڈی، جنوری ـ فروری ۲۰۰۸ء، ص۴۶

اسلام

/ تعلیمات

حقانی میاں قادری، ڈاکٹر حافظ	احتساب اور اُس کی ضرورت تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں	السیرۃ عالمی، کراچی، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۵۹

/ حدود و تعزیرات

غامدی، جاوید احمد	حدود و تعزیرات [۴]	اشراق، اگست ۲۰۰۸ء، ص ۴۷
سلیمان، محمد، حافظ	شرعی سزاؤں میں ترمیم و تغیر کا مسئلہ	الشریعہ، گوجراں والا، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۶
مشتاق احمد، محمد	آداب القتال، بین الاقوامی قانون اور اسلامی شریعت کے چند اہم مسائل	الشریعہ، گوجراں والا، نومبر۔ دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۵
ناصر، محمد عمار خان	زنا کی سزا [۱]	الشریعہ، گوجراں والا، مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۳۴
ناصر، محمد عمار خان	زنا کی سزا [۲]	الشریعہ، گوجراں والا، اپریل ۲۰۰۸ء، ص ۱۵
ناصر، محمد عمار خان	زنا بالجبر کی سزا	الشریعہ، گوجراں والا، جون ۲۰۰۸ء، ص ۶
ناصر، محمد عمار خان	شرعی سزاؤں کی ابدیت و آفاقیت کی بحث	الشریعہ، گوجراں والا، فروری ۲۰۰۸ء، ص ۱۸
ناصر، محمد عمار خان	دیت کی بحث [۴]	اشراق، لاہور، اگست ۲۰۰۸ء، ص ۲۵
ناصر، محمد عمار خان	سزا کے نفاذ اور اطلاق کے اصول [۲]	اشراق، لاہور، جون ۲۰۰۸ء، ص ۱۹
ناصر، محمد عمار خان	قصاص کے معاملے میں ریاست کا اختیار [۳]	اشراق، لاہور، جولائی ۲۰۰۸ء، ص ۲۹
ناصر، محمد عمار خان	قصاص و دیت میں مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز [۵]	اشراق، لاہور، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۳
ناصر، محمد عمار خان	شرعی سزاؤں کی ابدیت و آفاقیت [۱]	اشراق، لاہور، مئی ۲۰۰۸ء، ص ۱۷

/ عقائد و عبادات

حسن الدین احمد، ڈاکٹر	انفاق فی سبیل اللہ	ترجمان القرآن، لاہور ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۶۳
راشد نسیم	یومِ عرفہ کا پیغام	ترجمان القرآن، لاہور، دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۳۷
زبیر، حافظ محمد	کیا فطرت اصلاً یا تبعاً مصدرِ شریعت ہے؟	الشریعہ، گوجراں والا، مئی ۲۰۰۸ء، ص ۳۲
طالب محسن	اذان کے کلمات	اشراق، لاہور، نومبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۱
عبدالمالک، مولانا	فریضہ زکوٰۃ کی ادائیگی	ترجمان القرآن، لاہور ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۷۹
عبدالمالک، مولانا	نفلی روزے	ترجمان القرآن، لاہور اگست ۲۰۰۸ء، ص ۴۳

غامدی، جاوید احمد	روزہ	اشراق، لاہور، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۲
غامدی، جاوید احمد	قانونِ عقائد و عبادات	اشراق، لاہور، فروری ۲۰۰۸ء، ص ۳۹
نادیہ صدف	موت کے بعد	ترجمان القرآن، لاہور اگست ۲۰۰۸ء، ص ۴۹
ناصر، محمد عمار خان	زنا کی سزا [۵]	اشراق، لاہور، نومبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۱
نور، ایس ایم	روزے کے طبّی، نفسیاتی اور روحانی اثرات	انشا، کولکتا، ستمبر، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۴

/ متفرقات

طالب محسن	متفرق سوالات	اشراق، لاہور، فروری ۲۰۰۸ء، ص ۶۳

/ مسائل و تفقہ

رفیع مفتی، محمد	جھوٹی قسم کھانے، خودکشی کرنے، مومن پر لعنت کرنے اور اُسے کافر کہنے کا انجام	اشراق، لاہور، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۲۲
رفیع مفتی، محمد	مشرکانہ قسم کا حکم	اشراق، لاہور، نومبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۷
رفیع مفتی، محمد	نذر قسم ہی ہے	اشراق، لاہور، فروری ۲۰۰۸ء، ص ۹
ساجد حمید	حلال مردار اور حلال خون	اشراق، لاہور، فروری ۲۰۰۸ء، ص ۱۱
ساجد حمید	شکار اور اہلِ کتاب کے برتن	اشراق، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۹
ساجد حمید	مردہ مچھلی کا گوشت	اشراق، لاہور، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۲۷
غامدی، جاوید احمد	سود کا مسئلہ	اشراق، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۲
غامدی، جاوید احمد	قسم اور کفارۂ قسم	اشراق، لاہور، نومبر ۲۰۰۸ء، ص ۶۱
معز امجد	مومن اور منکر میں فرق کے بارے میں ایک روایت	اشراق، لاہور، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۱۸

/ معاشرت و معاملات

امجد عباسی	آزادیٔ رائے اور تضحیکِ مذہب	ترجمان القرآن، لاہور، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۴۱
غامدی، جاوید احمد	اخلاقیات	اشراق، لاہور، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۵۳
غامدی، جاوید احمد	خورونوش	اشراق، لاہور، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۵۱
غامدی، جاوید احمد	رسوم و آداب	اشراق، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۶۱
غامدی، جاوید احمد	قانونِ جہاد	اشراق، لاہور، جولائی ۲۰۰۸ء، ص ۵۵

غامدی، جاوید احمد	قانونِ دعوت	اشراق، لاہور، جون ۲۰۰۸ء، ص ۵۷
غامدی، جاوید احمد	قانونِ سیاست	اشراق، لاہور، اپریل ۲۰۰۸ء، ص ۵۵
غامدی، جاوید احمد	قانونِ معاشرت و معاملات	اشراق، لاہور، مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۴۷
غامدی، جاوید احمد	قانونِ معیشت	اشراق، لاہور، مئی ۲۰۰۸ء، ص ۴۹
حقانی میاں قادری، ڈاکٹر حافظ	فکر و تدبیر، تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں	السیرۃ عالمی، کراچی، مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۲۹۳
خورشید احمد، پروفیسر	اسلام اور جمہوریت: فکری اور عصری جہت	ترجمان القرآن، لاہور، فروری ۲۰۰۸ء، ص ۴۵
زاہد الراشدی، ابوعمار	اسلام اور شہری حقوق و فرائض: غیر مسلم معاشرے کے تناظر میں	الشریعہ، گوجراں والا، جولائی ۲۰۰۸ء، ص ۲
نظر حجازی	اختلافِ رائے یا دین میں وسعت	ترجمان القرآن، لاہور، اپریل ۲۰۰۸ء، ص ۲۷

/ معاشیات

زاہد صدیق مغل، محمد	اسلامی معاشیات یا سرمایہ کاری کا اسلامی جواز [۱]	الشریعہ، گوجراں والا، اگست ۲۰۰۸ء، ص ۱۷
زاہد صدیق مغل، محمد	اسلامی معاشیات یا سرمایہ داری کا اسلامی جواز [۲]	الشریعہ، گوجراں والا، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۳۲
زاہد صدیق مغل، محمد	اسلامی معاشیات یا سرمایہ داری کا اسلامی جواز [۳]	الشریعہ، گوجراں والا، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۴

اشاریے + کتابیات

سمیع الرحمان	مجلہ نقوش میں ذخیرۂ اقبالیات	اقبالیات، لاہور، جنوری۔ مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۶۵
عارف گھانچی، حافظ محمود	اردو کتابیاتِ سیرت ۱۹۸۱ء تا ۱۹۹۱ء	السیرۃ عالمی، کراچی، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۳۶۱
عارف گھانچی، حافظ محمود	جدید کتبِ سیرت ۲۰۰۸ء۔ ۲۰۰۰ء	السیرۃ عالمی، کراچی، مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۳۸۵
عارف گھانچی، حافظ محمود	جدید کتبِ سیرت ۲۰۰۸ء۔ ۲۰۰۷ء	السیرۃ عالمی، کراچی، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۳۸۹

اصغر ویلوری

اثر، پروفیسر محمد علی	کچھ اصغر ویلوری کے بارے میں	شاعر، بمبئی، اپریل ۲۰۰۸ء، ص ۱۲
برق، طلحہ رضوی	اصغر ویلوری اور رباعی	شاعر، بمبئی، اپریل ۲۰۰۸ء، ص ۱۳

خوش خبری

انجمن کی ویب سائٹ کا اجراء

www.anjumantaraqqiurdu.com

انجمن ترقی اُردو کی ویب سائٹ پر کام شروع ہو چکا ہے۔ اب دنیا بھر میں پھیلے ادب، علم اور زبان دوست اس ویب سائٹ کے ذریعے انجمن کی کتابوں اور رسائل تک رسائی حاصل کر سکیں گے اور انجمن کی علمی، ادبی، تحقیقی اور اشاعتی سرگرمیوں سے بھی باخبر رہیں گے۔ انجمن کے ماہنامے ''قومی زبان'' اور ''سہ ماہی اُردو'' کو عنقریب ویب سائٹ پر جاری کر دیا جائے گا۔

واضح رہے کہ انجمن کی ویب سائٹ کو دیگر اردو ویب سائٹ سے بھی مربوط کیا جا رہا ہے۔

Regd M. No. 270 Phone: 4811406

Monthly **QAUMI ZABAN** Karachi

انجمن کی مجوزہ عمارت کا نقشہ

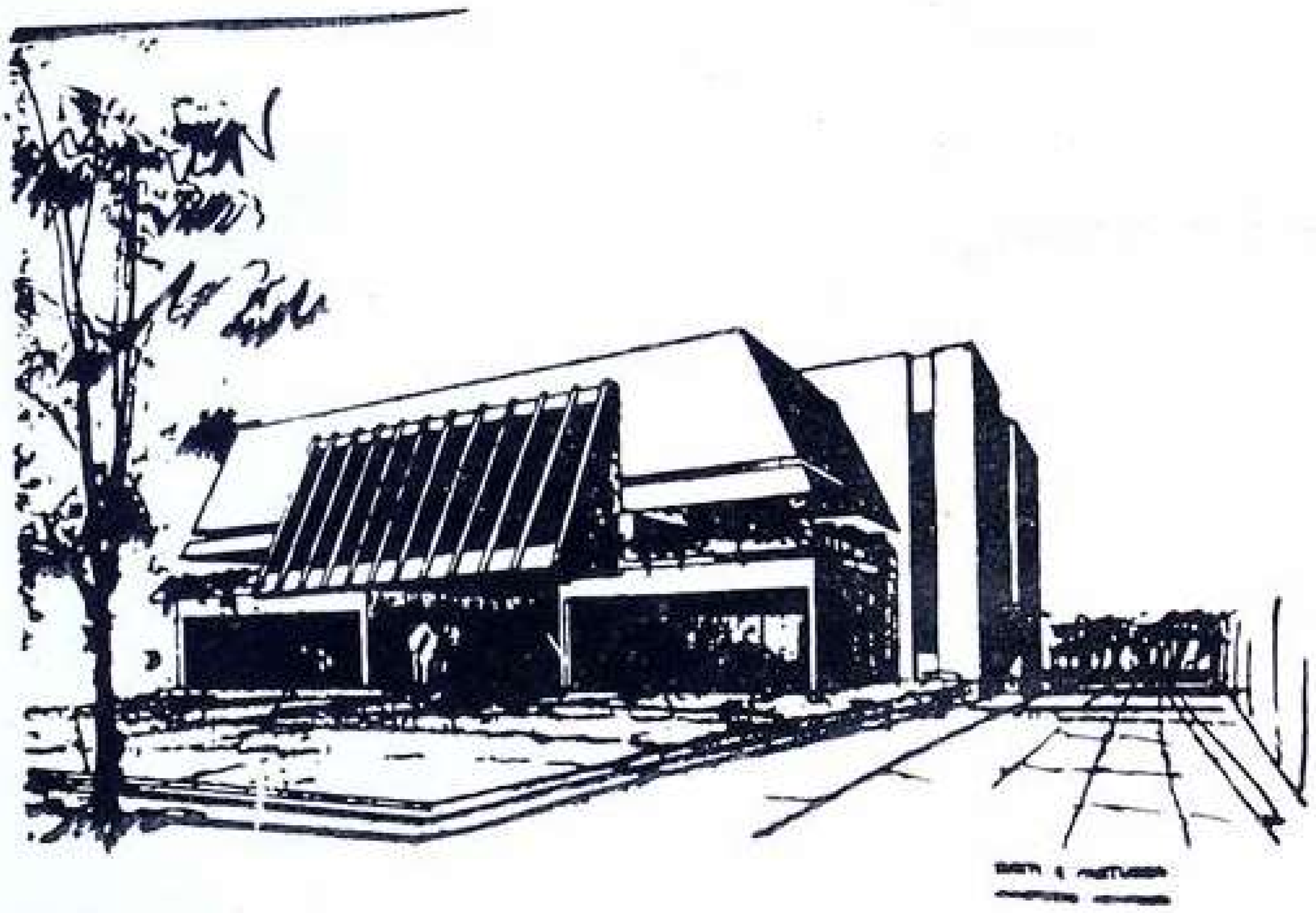

خدا کا شکر ہے کہ انجمن کی مجوزہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جا چکا ہے۔

اس منصوبے کی تکمیل کے لیے تمام محبانِ اردو کا تعاون درکار ہے۔

ممتاز احمد خان، مدیر قومی زبان، نے انجمن ترقی اردو پاکستان (ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی) کے لیے احمد برادرز، ناظم آباد، کراچی سے شائع کیا۔